معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسّی روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے — فی شمارہ سات روپے

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس۔ ایم۔ کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج ذیل خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۶۷ ماہ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ مطابق ماہ جون ۲۰۰۱ء عدد ۶

فہرست مضامین

شذرات

معارف کو تحزب اور فرقہ آرائی سے کوئی واسطہ نہیں رہا ہے، اس نے شروع ہی سے اس کی مذمت کی ہے اور مسلمانوں کے لئے اسے سم قاتل سمجھا ہے، اس پرآشوب دور میں ہندوستان ہی کیا متعدد ملکوں میں مسلمانوں پر شدید مظالم ڈھائے جارہے ہیں اور اسلام دشمن عناصر ان کے وجود ہی کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں، ایسے زمانے میں جو اشخاص اور جماعتیں اختلاف و انتشار اور محاذ آرائی کو بڑھانے میں لگی ہوئی ہیں، یہ ان کی نادانی، عاقبت نا اندیشی اور مسلمانوں کی بدنصیبی ہے، مسلمان تو اپنی بداعمالیوں اور افتراق کی وجہ سے خود ہی نہایت بے دم ہوچکے ہیں، ایسے میں لڑا بھڑا کر ان کی بچی کھچی طاقت کو ضائع کرنا نہایت بدبختی ہے، سب سے بڑھ کر دکھ کی بات یہ ہے کہ دینی و ملی تنظیمیں اور مسلمانوں کی ذمہ دار جماعتیں بھی اس مشکل گھڑی میں ان کو فقہی و فروعی اختلافات میں الجھا کر شیرازۂ اسلامی کو تار تار کررہی ہیں، چنانچہ جس قوت و توانائی کو مسلم دشمنوں کی یلغار کے مقابلہ و مدافعت میں صرف ہونا چاہیے تھا وہ ان کے اپنے اپنے فرقوں اور گروہوں کی بالادستی و برتری کو قائم رکھنے اور دوسرے مسلم فرقوں کو پسپا اور پامال کرنے میں صرف ہورہی ہے **یا للعجب!!**

مسلمانوں کی ایک قدیم جماعت جس کی گذشتہ خدمات بڑی شاندار رہی ہیں اور جو عرصے تک ان کے مختلف فرقوں اور طبقوں کی نمائندگی کرتی رہی ہے مگر اب وہ سمٹ سمٹا کر ایک ہی طبقے بلکہ اس کے بھی صرف ایک حصے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، حال ہی [illegible] اس کی ایک کانفرنس میں مسلمانوں کی ایک اور جماعت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی چوٹ سے وہ کراہ رہی ہے، اس نے ہم سے اور غالباً ملک کے دوسرے حضرات سے بھی کچھ سوالات کئے ہیں، اس پر ہم اپنا شدید کرب اور تکلیف ظاہر کرتے ہیں اور بلا کسی جانبداری کے یہ عرض کرنے کی جسارت کرتے ہیں کہ زیادتی کرنے والی جماعت کو اپنا طرز عمل اور انداز فکر بدلنا چاہئے، نفرت و اشتعال انگیزی سے نہ قوم و ملت کا کچھ بھلا ہوگا اور نہ خود اس جماعت کا بھلا ہوگا بلکہ اس سے اس کی اور قوم کی فضیحت اور رسوائی ہوگی، دوسری جماعت کو بھی چیخ و پکار کے بجائے صبر و تحمل سے کام لینا اور اس پر غور کرنا چاہئے کہ اسے ہی کیوں نشانہ بنایا گیا ہے، ہم ایک عرصے سے دیکھ رہے ہیں کہ ان دونوں جماعتوں کے

اخبار اور رسالے ایک دوسرے کے خلاف برابر مضامین شایع کررہے ہیں حالانکہ جن امور کے احقاق و ابطال کے لئے یہ مضمون نگاری ہورہی ہے ان پر صدیوں سے بحث و نزاع کا سلسلہ جاری ہے، اس کے باوجود ان کا تصفیہ نہیں ہوسکا۔ خدارا دونوں اور مسلمانوں کی تمام جماعتیں وقت اور حالات کی نزاکتوں کو محسوس کریں اور اپنی مظلوم و مقہور امت پر رحم کریں، یہ وقت ان جھگڑوں اور مناقشوں کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ؎

اے گرفتارِ قفس وقتِ پرافشانی ہے
پھر ملے شاخِ نشیمن تو غزل خواں ہونا

اس ملک میں مسلم جماعتوں کے کرنے کے بہت سے کام ہیں، مسلمان گوناگوں مسائل و مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں، ارباب سیاست چاہتے ہیں کہ وہ ان میں الجھے رہیں اور انہیں اپنی اصلاح، ترقی اور تعمیر کی جانب توجہ کرنے کی فرصت نہ ملے، فرقہ پرست اور رجعت پسند جماعتیں تو ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑی ہی رہتی ہیں لیکن سیکولر جماعتیں بھی چاہتی ہیں کہ فرقہ پرست عناصر ان کو اپنے گھیرے میں لئے رہیں تاکہ وہ ان کے دست نگر اور محتاج بنے رہیں، کیا اب بھی اس کا وقت نہیں آیا ہے کہ مسلم جماعتیں اپنے فروعی اور مسلکی اختلافات سے کلیتاً دستبردار ہوجائیں اور وہ مسائل جو سب گروہوں اور فرقوں کے مشترکہ ہیں اور جو سب کے لئے درد سر بنے ہوئے ہیں انہیں حل کرنے کے لئے سب متحدہ جدوجہد کریں اور مسلمانوں کی دینی، اخلاقی اور ذہنی پستی اور علمی، تعلیمی اور معاشی پس ماندگی دور کرنے اور ان میں بیداری اور سیاسی شعور پیدا کرنے کے لئے فکرمند ہوں، جن اشخاص اور جماعتوں کو قوم کی قیادت اور رہبری کا دعویٰ ہے ان کی ذمہ داریاں بہت بڑھی ہوئی ہیں ان سے دردمندانہ گزارش ہے کہ مسائل میں گھری ہوئی امت کے لئے مزید مسائل نہ پیدا کریں بلکہ ان کے حل کے لئے تگ و دو کریں۔

گزشتہ برسوں کی طرح اس سال بھی نئے تعلیمی سال کے لئے قرض وظیفے جاری کرنے کے واسطے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نئی دہلی کے سکریٹری جناب سید حامد نے ان مسلم طلبہ و طالبات سے درخواستیں طلب کی ہیں جنھوں نے دسواں درجہ (میٹرک) کم از کم ۸۰ فیصد، بارہواں (انٹر) یا اس کا مساوی امتحان ۷۵ فیصد یا گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کم از کم ۷۰ فیصد نمبروں سے پاس کیا ہو، جن طالب علموں کے نمبر اپنی اپنی ریاستوں میں درخواست دینے والے طلبہ میں سب سے زیادہ ہوں گے صرف ان ہی طلبہ و طالبات کو اکتوبر ۲۰۰۱ء میں کسی وقت سوسائٹی کے خرچ پر دہلی بلایا جائے گا، اس کے

بعد ہی وظیفوں کا فیصلہ ہوگا جو میٹرک پاس کو ۲۵۰ روپے انٹر پاس کو ۳۵۰ روپے گریجویٹ کو ۵۰۰ روپے اور پوسٹ گریجویٹ کو دو ریسرچ کے لیے ۱۲۰۰ روپے ماہانہ دیا جائے گا، جو طلبہ و طالبات وظیفے کے حقدار قرار پائیں گے ان میں ہر ایک کو ایک بانڈ بھر کر دینا ہوگا کہ تعلیم مکمل کر لینے کے زیادہ سے زیادہ دو سال کے بعد سے قرض وظیفے کی رقم وہ ماہ بہ ماہ (اگر چاہیں تو ایک مشت بھی) ان ہی قسطوں میں واپس کرنا شروع کر دیں گے جن قسطوں میں ان کو ملی تھی، وظیفہ پانے والے طلبہ کی تعلیمی پیش رفت کا ہر سال احتساب ہوگا، رفتار اطمینان بخش ہونے ہی پر وظیفہ کی تجدید کی جائے گی۔ اس اسکیم کے تحت ۱۹۸۶ء سے اب تک ۳۴۲ مسلم طلبہ و طالبات فیضیاب ہو چکے ہیں جو ملک کی ۲۱ مختلف ریاستوں سے تعلق رکھتے ہیں، غیر ملکی طلبہ کو یہ وظیفہ نہیں دیا جاتا، وظیفہ کی اسکیم سوسائٹی کے سابق صدر مرحوم حکیم عبدالحمید صاحب کے ایما پر (موجودہ صدر جناب عبدالمعید صاحب) اس لئے جاری کی گئی تھی کہ ہندوستانی مسلمان جو تعلیم میں پیچھے ہیں، انہیں تعلیمی میدان میں آگے لایا جائے اور ان میں مقابلے کا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ وہ تعلیمی پسماندگی سے نکل کر ملک کی ترقی میں زیادہ موثر کردار ادا کر سکیں، جو مسلم طلبہ وظائف پانے کے خواہش مند ہیں اور جن کا ارادہ ہے کہ وہ تعلیم کا سلسلہ عصری تعلیم کے کسی تسلیم شدہ ادارے میں کم از کم ۲۰۰۲-۲۰۰۳ء کے تعلیمی سال تک جاری رکھیں گے وہ سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی تعلیم آباد سنگم وہار نئی دہلی ۱۱۰۰۶۲ کے نام خط بھیج کر درخواست فارم منگوا سکتے ہیں۔ یکم ستمبر تک بھرے ہوئے فارم وصول کئے جائیں گے۔ اس کے بعد آنے والی درخواستوں پر غور نہیں ہوگا۔

گذشتہ کئی مہینوں سے ہم مسلسل اعلان کر رہے ہیں کہ معارف بڑے خسارے سے نکل رہا ہے اس لئے اب اس کی مفت ترسیل بالکل بند کر دی گئی ہے مگر عربی مدارس اور قومی اداروں اور انجمنوں کی جانب سے اب بھی معارف مفت جاری کئے جانے کی فرمائشیں کی جا رہی ہیں جن کی تعمیل سے بالکل معذوری ہے، ہمارے لئے اس طرح کے خطوط کا جواب دینا بھی مشکل ہے اس کا بھی اعلان کیا جا چکا ہے کہ آنے والی ششماہی (جولائی ۲۰۰۱ء) سے معارف کا سالانہ چندہ ۱۰۰/ روپے کر دیا گیا ہے۔

مقالات

نفسیات اکیسویں صدی میں

از

پروفیسر معزز علی بیگ صاحب ٭

(۲)

فروم نے انسانی شخصیت کے چار اہم پہلو بیان کئے ہیں۔ ان میں دو تو تعمیری ہیں جن کو وہ بارآور (Productive) کہتے ہیں اور دو وہ ہیں جو تخریبی ہیں۔ ان تخریبی پہلوؤں میں ایک وہ ہے جس کو وہ بازاری (Marketing Orientation) کہتے ہیں۔ یہ پہلو صرف اسی تہذیب کی دین ہے جو ہمیں اپنے چاروں طرف نظر آ رہی ہے۔ چنانچہ ہم اس سلسلے میں اپنے مذکورہ تحقیقی مقالے کا ایک اہم اقتباس پیش کر رہے ہیں جو بازاری شخصیت کو بے نقاب کرتا ہے:

"چوتھے پہلو کو فروم نے بازاری (Marketing) کے نام سے بیان کیا ہے، اس کے نزدیک یہ پہلو عصر حاضر کی انسانی شخصیت میں سب سے زیادہ نمایاں اور غالب ہے، یہ جدید تمدن کے اس بارونق بازار کی پیداوار ہے جس کو اس کے مخصوص سرمایادارانہ نظام نے جنم دیا ہے، بازاری شخصیت کی ذہنیت تمام تر تاجرانہ ہوتی ہے۔ انسان کی ساری قدر

٭ 15/43 گوداوری، وکاس نگر، لکھنؤ۔

وقیمت صرف اس بازار کے نرخ سے متعین ہوتی ہے جس میں اس کی مانگ ہو، چنانچہ اس بازار میں بکنے کے لئے تاجر، کلرک، ڈاکٹر، وکلاء اور فن کار سبھی آتے ہیں اور یہاں ان کی بکری ٹھیک اسی طرح ہوتی ہے جس طرح اشیاء کی۔ ان کا سارا کردار صرف اس نصب العین پر مرکوز ہوتا ہے کس طرح زیادہ سے زیادہ قیمت پر بکا جائے۔ نتیجے کے طور پر ان کی مسلسل جستجو یہ ہوتی ہے کہ شخصیت کی صرف وہ خوبیاں معلوم کی جائیں جن کی مانگ سب سے زیادہ ہے تاکہ ان کی قیمت بھی اسی اعتبار سے زیادہ سے زیادہ لگ سکے۔ بالآخر ان خوبیوں کی نقاب ڈال کر سطحیت کے یہ مجسمے اس بازار میں بکنے آتے ہیں۔ ان کے سارے کردار میں چھچھورپن۔ نقالی اور مصنوعی اخلاق جھلکتا ہے اور ان میں حقیقی انسانیت اور انسانی جذبات کا دور دور پتہ نہیں ہوتا۔ فروم کے نزدیک سرمایہ دارانہ نظام میں اس ذہنیت کو فروغ دینے کا سب سے بڑا ذریعہ سنیما، اشتہاری رسالے اور گھٹیا لٹریچر ہے۔ ان میں ان مصنوعی انسانوں کا کردار خوب کھل کر اور دیدہ زیب طریقہ سے سامنے آتا ہے۔ ان کی نقالی کرنے میں نوجوان طبقے کو شخصیت کی معراج نظر آتی ہے۔ بازاری شخصیت کی فکر وذہانت کا کمال صرف یہ ہے کہ فوری حالات سے فوری اور عارضی طور پر کم سے کم وقت میں مطابقت پیدا کی جائے۔ چنانچہ یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہونا چاہئے کہ انسان حسب ضرورت ایک چولا بدل کر دوسرا اوڑھ سکے، بہ الفاظ دیگر وہ ایک نقاب اتار کر فوراً وہ نقاب اوڑھ سکے جو اس تمدن کے بازار میں بک رہی ہو اور جس سے فوری مقاصد پورے ہوسکیں۔ چنانچہ ایسے ذہین اور دانشوروں کو چھانٹنے کے لئے ان کی ذہانت کی ناپ تول اور پیمائش کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کو اور خود ان کے خریدنے والوں کو یہ یقین ہوجائے کہ وہ اس بازاری زندگی کے فوری مقاصد کو بہترین طریقوں

سے انجام دینے کے قابل ہیں۔ چنانچہ ان کی عقل وذہانت کی ناپ تول اور اس کو طرح طرح سے جانچنے کے طریقے (Tests) مدون کئے گئے ہیں۔ فروم کے نزدیک یہ جانچ کے طریقے (Tests) آج کے بازاری تمدن کے بازاری علم کی پیداوار ہیں۔ ریاہائے متحدہ میں ان (Tests) کی تعداد غالباً اتنی ہی ہے جتنی اس ملک میں ذہنی امراض اور اخلاقی جرائم کی ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ علم کا ہے۔ وہ بھی فروخت ہونے والی چیز کی طرح سمجھ لیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ خود نفسیات کی بابت فروم کا یہ خیال ہے کہ وہ علم جس کا مقصد مغرب کی عظیم فکری روایات کے مطابق یہ تھا کہ اس کے ذریعہ ایک خوشگوار اچھی زندگی کا سراغ لگایا جائے، لیکن آج کے بازاری تمدن نے مسخ کر کے اس کو سیاسی پروپیگنڈے۔ اشتہار بازی اور بازاری حالات کی تحقیقات کا ذریعہ بنا دیا ہے۔

بازاری شخصیت کی زندگی کا عظیم ترین مقصد اس مسابقت میں بازی لے جاکر اپنے نرخ کو بڑھانا ہے جو اس بازار میں ہو رہی ہے۔ چونکہ بازاری شخصیت کے لئے زندگی میں سب سے بڑی کامیابی صرف یہی ہے اس لئے لامحالہ اس کی توجہات کا اصل مرکز بازاری نرخ کا اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ اس اندھی مسابقت میں ادنیٰ سی ناکامی بھی اس کے وجود کے لئے ایک عظیم خطرہ بن جاتی ہے اور اس پر احساس بے چارگی، کمتری اور خوف کو بری طرح مسلط کر دیتی ہے۔ چنانچہ اس سے بچنے کے لئے اس اندھی مسابقت میں دوسرے کو ڈھکیل کر کچل ڈالنا بھی قطعاً ضروری ہوتا ہے۔ بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے کہ اس مسابقت میں پیچھے رہ جانے والا کچلا ہوا انسان طرح طرح کی ذہنی بیماریوں کا شکار ہوجاتا ہے۔ بازار میں اس کی قیمت بالکل گر جاتی ہے اور وہ مسابقت کی تیز رفتار کے ساتھ دوڑنے

کے قابل ہی نہیں رہتا۔ بالآخر یہ رائج الوقت سکوں سے متعین ہونے والا معیار اس مصنوعی انسان کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا ہے اور اس کے جرم ضعیفی کی سزا میں مناسبت کی یہ اندھی رفتار اس کو بازاری کامیابی کے راستے سے ہٹا کر بہت دور پھینک دیتی ہے اور یہ سکے کے گرد گھومنے والی تہذیب اپنی تباہ کن گردش بدستور جاری رکھتی ہے۔"

۱۹۵۶ء میں پروفیسر سوروکن نے اپنی ایک کتاب میں اس بازاریت پسندانہ مزاج اور بازاری شخصیت کی ان "علمی تحقیقات" کو بے نقاب کیا جو ایک جھوٹے اور مصنوعی علم کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ کس طرح یہ ٹسٹ سازی ایک بامعنی، بامقصد اور فکر پرور علم کو دفن کرتی چلی جا رہی ہے۔ یہاں ہم ان کے دو اقتباسات سامنے لا رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

The spread of these diseases among the younger generation of psychosocial scholars is also understandable. The prevalent training of our graduate students in these fields consists largely of learning various techniques and research-procedures; statistical techniques, the techniques, of administering intelligence tests, temperament tests, projective tests, sociometric tests, and dozens of other tests that are taught used at the present time. Learning these procedures and tests is a time-consuming business. It leaves little time for students to study seriously the proper fields of sociology or other psychological science Their general knowledge of these sciences rarely goes beyond standard textbooks and a few monographs prescribed in their courses or necessary for their Ph.D. As a result, they receive the Ph.D. without having a substantial knowledge of their field. Repeatedly told by their professors that the tests and techniques are the most important and most scientific part of their discipline, and having spent most of their time in mastering these tests and procedures, the young Ph.D's end with a firm conviction that they have a masterful knowledge of the whole feild of sociology or psychology. When they have been so trained and when after long and painsta king research, they happen to discover a "sociological table of multiplication, " they are apt to believe they discovered it " for the first time in history." [p 18]

پھر ایک جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

f) Accordingly the prestige of the statistician, the pollster, the builder of "mathematical models" or "mathematical robots," the numerologist and the metrophrenic manipulator of numbers is now far above that of qualitative scholars. Of all the courses in the departments of the psychosocial sciences, a course in statistics is often the only one required from all students in these departments. Being ignorant in the history, theory, methods, and other fundamentals . . . . of sociology and psychology, they still can get their Ph.D. with high honors if they know elementary statistics. Without passing a satisfactory examination in statistics, they can hardly graduate or receive an advanced degree, inspite of an exellent knowledge of history, theory, and methods of these disciplines. Likewise, without being trained in ststisics, there is an over- decreasing chance if their being intructors or professors of the the psycholsocial sciences. These disciplines have become territories dominated by an occupational army of statisticians, bookkeepers accountants, numerologists, and metromanics.

We shall turn now to substantiation of the above charges.[1] [p.105]

سائنٹزم کا ایک نتیجہ اور برآمد ہوا جو بیک وقت نہایت المناک ہے۔ اس لئے ہم یہاں اس کے تحریری ثبوت پیش کریں گے اور اس کے بعد اس مصنوعی سائنس کے انہدام پر گفتگو کریں گے جو قرن ماضی کے دوسرے نصف حصے سے تیزی سے ہونے لگا ہے۔

۱۹۶۹ء میں وہ مکتب فکر باقاعدہ وجود میں آگیا جس کو ہم انسانیت پسندانہ کہتے ہیں۔ اسی سال اس مکتب فکر پر جو کتاب شایع ہوئی اس سے یہ اندازہ ہوا، اس مکتب فکر کے قائم کرنے والوں پر کس طرح سے مظالم کئے گئے۔ فنڈ روک لئے گئے۔ اشاعت تقریباً ممنوع قرار دے دی گئی۔ بازاریت پسندانہ مزاج کے لوگوں نے انسانیت پسندانہ فکر

---

[1] Fads and Foidles in modern sociology and related sciences Henry Regnery Company Chicago : 1956

دیکھنے والوں کی توہین بھی کی اور ان کو طرح طرح سے ذلیل کیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایسے اساتذہ کو OUTLAW قرار دیا گیا[1] بالعموم یہ ہوا کہ ایسے لوگوں کو نفسیات کے شعبوں سے نکلنا پڑا۔ خواہ ایذا رسانی کی وجہ سے خواہ ان کے خلاف سازش کے سبب۔ ہمارا دوسرا تحریری ثبوت ایک نہایت ہی تشویشناک بات کو سامنے لاتا ہے۔

۱۹۷۲ء میں ہندوستان ہوتے ہوئے امریکہ سے پروفیسر اسٹینلی کرپنر STANLEY KRIPPNER صاحب کی قیادت میں ایک وفد انسانیت پسندانہ مفکرین کا ماسکو جا رہا تھا۔ انہوں نے کچھ روز دہلی میں قیام کیا۔ مجھے بھی بلایا گیا۔ طویل گفتگو کے بعد بہت اچھے نتائج نکلے۔ ان کی ماسکو کی روانگی کے بعد جہاں وہ ایک کانفرنس منعقد کرنے گئے تھے مجھے، اگست ۱۹۷۲ء کا نیویارک سے چلا ہوا ایک خط موصول ہوا جس سے پتہ چلا کہ ماسکو میں ان بیس سائنس دانوں کے خلاف سوویت حکومت نے سخت کارروائی شروع کردی ہے جو انسانیت پسندانہ نفسیات کی بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ چنانچہ مجھ سے کہا گیا کہ ایک مخصوص پتے پر ہندوستان سے یہ لکھ کر فوراً بھیجوں کہ یہ مکتب فکر خود ایک سائنس کی نمائندگی کر رہا ہے۔ میں عجب شش و پنج میں تھا کہ مورخہ ۲۲ اگست کا کیلی فورنیا سے چلا ہوا پھر ایک خط مجھے ملا اور ہدایت کی گئی کہ میں ہرگز کوئی خط ماسکو اس لئے نہ بھیجوں کہ وہاں کی اطلاع کے مطابق ایسا کرنے سے ان بیس سائنس دانوں کے خلاف شدید کارروائی ہوگی۔ نہ جانے ان کا کیا حشر ہو۔

بات دراصل یہ ہے کہ یہی وہ مکتب فکر ہے جس نے مادہ پرستانہ فکر پر ایک کاری

[1] Authony J. Sutich and Miles A. Vich: Readings in Humanistic Psychology. Free Press : USA. 1969 [pp. 3 - 4]

ضرب لگائی ہے اور سائنٹزم کے خلاف ایک موثر قدم اٹھایا ہے جس میں اس کے لئے سب سے "خطرناک" بات یہ ہے کہ انسانیت پسندانہ فکر آمریت اور آمرانہ جمہوریت کا دشمن ہے اور اس نے اس نظریہ علم کی جڑوں کو ہلا ڈالا اور بالکل بے نقاب کر دیا ہے جو مادہ پرستانہ فکر پر قائم ہونے والی آمریت کو اور آمرانہ جمہوریت کو سہارا دئے ہوئے ہے۔ آمرانہ جمہوریت کی ایک مثال امریکہ میں صدر نکسن نے قائم کردی اور آمریت پسندانہ علم کی نمائندگی کو B.F. Skinner اسکنر نے اپنی کتاب[1] BEYOND FREED-OM AND DIGNITY میں یہ بتایا کہ انسانی وقار اور اس کی عظمت اور انسانی آزادی سے وابستہ وہ تمام تصورات جو مذہب، اخلاقی تصورات اور روایتی علم Traditional-Knowledge ہے ان کو برطرف کر دینا چاہئیں۔ اور ایک نئی "سائنس" یعنی Behavi-our Technology کے ذریعہ سمجھنا چاہئے۔ نہ تو انسانی وقار و عظمت فی نفسہ کوئی اعلیٰ اور ارفع چیز ہے اور نہ تصور آزادی یہ تو سب Conditioning سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہی معاملہ اقدار اور احساسات کا ہے۔ وہ انسان جو اندرون سے یا Inner Self سے عبارت ہے، وہ انسان جو انسانی عظمت اور انسانی وقار کو قدر واقعی سے (Real Value) جوڑے ہوئے ہے، وہ انسان جو کسی فطری آزادی کے تصور کو لے کر چل رہا ہے اب ختم ہے۔ اسکنر کا Scientific Analysis اس کو ان تمام باتوں سے محروم کر دے گا۔ اور اسکنر کی Behaviour Technology اور انسانی انجینئرنگ Human Engineering اس کو وہ بنائیں جو کسی آمرانہ نظام کی پالیسی ان "ماہرین نفسیات" سے چاہے گی۔ اسکنر کے لئے انسانی آزادی اور انسانی وقار و عظمت، یہ تصورات بڑے ہی پریشان کن [Tro-ublesome] ہیں۔ ان کو بہر حال مٹا دینا ہے (Abolish) انجام کار یہ ہے کہ

[1] Alfred A. Knopf New York : 1974.

" we do not need to try to discover what personalities, states of mind, feelings, frails or character, plans, purposes, indentious or other prequisites of autonomous man really are in order to get on with scietific analysis." [p.15]

چنانچہ اب جو ضرورت ہے وہ یہ ہے :

" What is needed is a technology of bahaviour, but we have been slow to develop the science from which such a technology might be drawn." [24]

اسکنر کے ان مہمل تصورات سے جو نتائج آمریت پسندانہ مزاج کے لئے نکل سکتے ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ یہ ہیں سائنٹزم کے وہ نتائج جو اب تک ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ دراصل سائنٹزم اس بازاری تہذیب کی روح رواں ہے۔

چنانچہ اب صورت حال یہ ہے کہ اگر آپ مہلک سے مہلک اور رکیک سے رکیک تجربات کے ساتھ لفظ سائنس یا ٹکنالوجی جوڑ دیں تو وہ خود اپنے لئے جواز بن جاتی ہے۔

اس بازاری تہذیب نے خراب سے خراب اور ملاوٹ کا مال بیچنے کے لئے جو ناپاک، ذلیل اور چھچھورے طریقے TV پر اور اخبارات میں استعمال کرنا شروع کئے ہیں وہ سنجیدگی اور ایمانداری کے منھ پر طمانچہ ہیں۔ جو سائنٹفک طریقے اس نے چوری، زناکاری، دھوکہ بازی، قتل، اغوا اور نہایت سنگین جرائم کے لئے ایجاد کئے ہیں ان کو برداشت کرتے رہنا ہمارے نزدیک ایک اخلاقی جرم ہے اور انسانی عظمت، وقار اور شرافت سے کھلی دغابازی ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تہذیب نہ صرف انسان کو اس کی روحانی اور اخلاقی موت کے

خندق میں پھینک چکی بلکہ اب یہ اس کی طبعی موت (Physical Death) کی تیاری میں مصروف ہے۔ یہ اللہ کو شیطان کا وہ زبردست چیلنج ہے جو انسانی تہذیب کی لگ بھگ سات ہزار سالہ تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا، کیونکہ دنیا کبھی بھی اتنی سمٹ کر اور سکڑ کر ایک چھوٹی سی بستی نہیں بنی تھی۔

دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سا آدم نو ہے جس کا یہ "روح ارضی" اب "استقبال" کرے گی. وہ آئے گا بھی یا نہیں؟ کیا ایسا تو نہیں ہے کہ اس آدم خاکی کی یہ کہانی اب ختم ہونے جارہی ہے.؟ ان سوالات کا جواب صرف ایک امید کی بنا پر دیا جا سکتا ہے۔

بہر حال اب تک تو اس تہذیب کے تمام مثبت اور منفی خصائص کو دیکھتے ہوئے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے۔

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شیطان یہ خوب اور اچھی طرح جانتا ہے کہ

آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحب یقیں

اب جس امید کی بنا پر ان سوالات کا جواب دیا جا سکتا ہے وہ صرف اللہ کا وہ جواب ہے جو ابلیس کو اس طرح مل چکا ہے " فالحق والحق اقول " "میں تجھکو اور تیرے متبعین کو جہنم میں جھونک دوں گا"۔

ہمیں یہ امید اس طرح اور بڑھ جاتی ہے کہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ انسانی ذہن اس علم کی فکری گرفت سے بہت بڑی حد تک نکل چکا ہے جو اس کے لئے ایک زہریلا سانپ ہے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اس انسان دشمن بازاری تہذیب کا یہ پورا نظام

اقدار اس کے تصور حقیقت اور نظریہ علم میں اتنی گہرائی سے اترا ہوا ہے کہ جب تک اس کو پوری طرح برطرف نہیں کر دیا جائے گا اس کی بربریت اور انسانیت کشی میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ لیکن اس کے تصور حقیقت ONTOLOGY) اور نظریہ علم کو اس وقت تک برطرف نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس کی اساس کو جو تصور دوئی اور زمان، مکان، تصور اسباب و علل (CAUSALITY) پر قائم ہے توڑ نہ ڈالا جائے اور ایک نعم البدل پیش نہ کر دیا جائے۔ ہم اب تک یہ سمجھ نہیں سکے ہیں کہ اس کا تصور حقیقت یا Ontology دراصل دوئی کے سبب Divisive ہے اور یہ ہمیں Age of Enlighterment سے ورثہ میں ملا ہے۔ جدید طبعیات نے دراصل اس دوئی کو ختم کر دینے کا راستہ ہمیں بتا دیا ہے۔ جہاں تک اس کے نظریہ علم کا معاملہ ہے یعنی Epistemology کا تو پتہ چلا کہ وہ خود اپنا سد باب کر رہی ہے۔ وہ نہ صرف Self- Limiting ہے بلکہ Self- depeatmg بھی ہے۔ بدقسمتی یہ رہی ہے کہ اب تک ہم نے اس امر کی کوئی کوشش نہیں کی کہ قرآن مجید کی دی ہوئی روشنی میں اس کو آنکھیں کھول کر دیکھیں اور یہ دیکھیں کہ ان بکھرے ہوئے افکار کو کس طرح یکجا کر دیا جائے جو قرن ماضی میں جدید طبعیات نے آگے بڑھا دئے ہیں اور کس طرح ہم یہ کر کے ایک Integral Vision of Reality، کو سامنے جو وجود کی اکائی ہے اور انسانی زندگی کے لئے ایک Existential Synthesis فراہم کرتی ہے۔

نفسیات کے میدان میں انسانیت پسندانہ فکر کا آغاز، طبعیات، ریاضی اور دیگر طبعی علوم میں ان باتوں کا مشتبہ ہو جانا جو مادہ پرستانہ فکر کی اساس ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سائنٹزم کے منہدم ہونے کے عمل کو حرکت میں آ جانا، یہ سب یہ بتاتا ہے کہ موجودہ صدی شاید وہ صدی ہے کہ جس میں اس خدا بیزار اور انسان دشمن تہذیب کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اب جو انسانیت کی تعمیر نو کے امکانات ہیں اس میں نفسیات کیا حصہ لے گی اس پر گفتگو سے پہلے ہم یہ اچھی طرح جان لیں کہ اس انہدام کے کیا اسباب ہیں اور یہ کس طرح ہو رہا ہے۔

سائنٹزم کا انہدام سائنٹزم کے انہدام کا سب سے اہم سبب طبعیات کا وہ موڑ ہے جس نے کلاسکی طبعیات Classical Physics کو پیچھے چھوڑ دیا اور اس کے بہت سے "آئین یقینی" میں رد و بدل کر دیا۔ چنانچہ ہم پہلے اسے یہاں دیکھیں گے۔ دسمبر ۱۹۰۰ء کی چودہ ۱۴ تاریخ تھی جب جدید طبعیات کے ایک ممتاز ترین مفکر ماکس پلینک Max Planck نے بیس سالہ تحقیقات کے ایک نہایت ہی پتھریلے راستے سے گزر کر اپنا وہ نظریہ پیش کیا جس کو ہم (Quantum Theory) اور (Quantum Machenics) کے نام سے جانتے ہیں۔

ماکس پلینک کو جب کبھی بھی مایوسی کا سامنا کرنا ہوتا تھا تو وہ اپنے سامنے اتنا بڑا پسندیدہ جرمن MOHO لے آتے تھے Man Muss Optimist seen اور سائنس کے شیدائی کا تو یہ اصول ہونا چاہئے Ye must have faith ہم یہاں ان کے نظریہ کا خلاصہ بیان کر کے خود ان کے اس تصور اسباب و علل کی طرف رجوع کریں گے جو حیرت ہے کہ ایک مقام پر اسلامی تصوف سے جا ملتا ہے۔

اب ہم یہاں پوری علمی ذمہ داری کو اپنے اوپر لیتے ہوئے پورے وثوق کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ماکس پلینک کا تصور اسباب و علل ہم کو کسی ایسے "عالم امر" کا پتہ دے رہا ہے جس پر کسی ایسی ہستی کی مکمل گرفت ہے جو اس کائنات کے ایک ایک Sub- atomic event کو اپنے قبضہ میں کئے ہوئے ہے۔ چنانچہ نفسیاتی عمرانی علوم Causality کا ہرگز ہرگز اطلاق نہیں ہوتا جس کے لئے سائنٹزم نے نہایت

غلط طور پر ایک ناجائز دخل اندازی کی ہے[1] اور اس طرح ایک فرضی علم کی عمارت کھڑی کردی اور ہم مزید وثوق سے یہاں یہ بھی کہہ دینا چاہتے ہیں کہ جدید فلکیات، طبعیات اور نفسیات میں PSI Phenomena کو دیکھ کر عقل، باریک بینی، فکر اور عام سمجھ بوجھ کو ایک ایسا جھٹکا لگتا ہے کہ یہ سب منہ کے بل گر پڑتے ہیں۔ وہ جھٹکا اس وقت لگتا ہے جب ہمیں صاف صاف یہ نظر آنے لگتا ہے "لو کان البحر مدادا لکلمات ربی ....الخ

اسی سلسلے میں جدید طبعیات کا وہ عالم جو علمی اعتبار سے دیوقامت ہے یعنی ورنر ہائسنبرگ (WERNER HEISENABERG) اس طرح بیان کرتا ہے:

" In 1900 Max Planck Published the following statement: *Radiant heat is not a continuous flow and indefinitely divisible.It must be defined as a discontinuous mass made up of units all of which are similar to one another.*

At that time he could scarcly have foreseen that with in a span or less than thirty years this theory, which flatly contradicted the principles of physics hitherto known, would have developed into a doctrine of atomic structure which, for its scientific comprehensiveness and mathematical simplicity, is not a whit inferior to the classical scheme of theoretical physics."

[Ibid : p. 21]

Original Werner Heisenberg : Die nature wissen schaften Vol 26. p.483.

ٹھیک یہی وہ بات جس کی بنا پر سببیت CAUSALITY کا وہ تصور درہم برہم ہوگیا جو نیوٹن۔ گلیلیو۔ کپلر۔ گلبرٹ۔ ایوگیدرو اور ڈالٹن جیسے عظیم المرتبت طبعیات

---

[1] Max Planck : where Science is going? George Allen & Unwin : London [ch. 4 and 5] 1933.

اور کیمسٹری کے عالموں کا وہ اصل الاصول تھا جس پر سائنس کی عمارت قائم ہو سکتی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کے دور رس نتائج نہ صرف ماکس پلانک کے یہاں نظر آتے ہیں بلکہ جیسا کہ ہم بیان کریں گے نفسیات میں ۱۹۶۰ء کے بعد سے ظاہر ہوئے

ایک ستون کے ہلنے سے عمارت کا سب سے بڑا حصہ منہدم ہونے لگا۔ یعنی وہ جس پر نفسیات میں مادہ پرستانہ فکر کو آگے بڑھ کر سائنٹزم کو جنم دینے کا موقع ملا تھا۔

۱۹۰۵ء میں طبعیات کے دوسرے دیوقامت عالم آئنسٹائن نے اپنا خصوصی نظریہ اضافیت SPECIAL THEORY OF RELATIVITY پیش کیا جس کی بنا پر انہوں نے تصور مکاں (SPACE) کو اس کے مقام سے ہٹا دیا جہاں وہ ایک مطلق Absolute حیثیت رکھتا تھا۔ مزید برآں انہوں نے تصور زماں (TIME) کو بھی اسی طرح بدل ڈالا گویا SPACE - TIME بحیثیت باہمی وابستہ CATEGORIES کے اپنی فی نفسہ ایک مطلق حیثیت کھو کر صرف اضافی ہو گئے دراصل یہ بہت بڑی دین تھی اس GEOMETRY کی جو اقلیدس Enclid کے Axiowatics سے نکل کر ریمین (REIMANN) بولیائی (BOLYAI) لوباشیوسکی LOBACHEVSKY اور گاس (GAUSS) کی توجیہات کی رہین منت ہو گئی۔

اس کی بنا پر آئنسٹائن نے اپنا وہ ENERAL THEORY OF RELATIVITY پیش کی جس نے کائنات کو اتنی وسعت دے دی کہ اب یہ کبھی نہ ہوگا کہ اسے یہ سننا پڑے کہ "خجل آمد ز تنگ دامانی"[1] آئنسٹائن نے زماں اور مکاں کو فیلڈ (FIELD)

---

[1] یہ مصرع علامہ اقبال کے اس شعر کا ہے جو انہوں نے جرمن مفکر H. GEL کے لئے کہا تھا۔

" پیش ارض خیال او گیتی   خجل آمد ز تنگ دامانی "

کے تصور کے تحت کر دیا جس کے لئے وہ لکھتے ہیں: [1]

" There is no such thing as an empty space, ie, a space without field. Space-time does not claim existance on its own, but only as a structural quality of the field." [3: p 155]

یہاں پر اگر ہم ان تمام اثرات کی تفصیلات بیان کرنا چاہیں جو جدید طبعیات کے دیگر علوم پر پڑنا شروع ہو گئے ہیں تو یہ گفتگو اپنے موضوع سے بہت ہٹ جائے گی۔

اس لئے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ SPACE, TIME, CAUSALITY کی ان توجیہات کے بدل جانے سے جو Classical Physics سے چلی آ رہی تھیں نفسیاتی عمرانی علوم پر سے ان بے جا قیود کو ہٹنا پڑا ہے جو POSITIVISM, DETERMINISM, OBJECTIVISM اور OPERTIONISM کے تحت عائد کی گئی تھیں اور جو سائنٹزم کی خصوصیات ہیں۔

طبعیات کے جن مفکرین کا گہرا اثر اس معاملہ میں ہمیں نظر آتا ہے وہ علاوہ مذکورہ حضرات کے یہ ہیں۔ بوہر[2] Bohr ۔ شرودنگر[3] Schrodinger ایڈنگٹن[4]

[1] صفحہ ۳۵ سے ۴۰ تک جو کچھ کہا گیا اس کے لئے دیکھیے:

Ad ABRO The evolution of scientific thought from Newton to Einstein : Dover Publications USA 1950.

Albert Einstein : Relativnlity : Methuen Co London : 1954

The Impact of Relativity and Quantum Mechanics on Philosophy Proceedings First National Seminar on History & Philosophy of Science : Guru Nank Dev University: 1987

Atomic Physics and Human Knowledge John Wiley & Sons New York : 1958. [2]

Mind and Matter Cambridge Univ Press : 1958 [3]

Sir Arther Eddington[1] اوپن ہائمر[2] J.R.Oppenheimer جیمس جینز[3] Sir James Jeans - ڈیوڈ بوہم[4] (DAVID BOHM)

یہ تھا وہ جدید طبعیات کا فکری انقلاب جس نے پورے انسانی فکر کو بدل ڈالا[5] اور یہ بتا دیا کہ اب کائنات کی صورت حال یہ ہے کہ " آدمی ہے دما دم صدائے کن فیکون"۔

ہم یہاں یہ بات بھی قطعی واضح کر دینا چاہیں گے کہ اگر نظریہ ارتقا اور اس سے وابستہ تصورات کو لے کر یہ نتیجہ نکالنا ایک فاش غلطی ہوگی کہ اس کرہ ارض پر زندگی ایک حادثہ کے تحت وجود میں آ گئی۔ جیسا کہ برنال[6] J.D Bernal کا خیال ہے اور ان متعدد سائنس دانوں کا جو اس بات کو واہمہ سمجھتے ہیں کہ زندگی علاوہ حادثے کے کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔

یہ وہ بات ہے جس کو بلجیم کے ایک عظیم المرتبت ماہر حیاتیات Leuconte du Nouy[7]

[1] The Philosophy of physical science: Univ. of Michigan Press 1958

[2] Science and the Common Understanding : Oxford Univ. Press London : 1954

[3] This Mysterious Universe : London : 1927

[4] Wholeness and the Implicate Order : Rouhledge & Keyson Paul. London 1980

[5] Steven Weinberg : the Great Reduction : Physics in the Twentieth Century:
In: M Howard and W.M.R. Louis [ed]
The Oxford History of the Twentieth Century . Oxford University Press : 1998

[6] The Physical Basis of Life : Rouhledge & Kegan Paul: London 1951.

[7] Human Destiny : The New American Library : 1949 : Chapters 3

اوران کے ہم عصر Michael Polyani[1] نے ہمیشہ کے لئے ختم کردیا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح برونو (Bruno) نے اس بات کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا کہ دنیا مسطح ہے۔ لیکن زمین کو گول ثابت کرنے کے بعد اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ زندہ جلا دیا گیا۔

طبعیات، ریاضی، حیاتیات اور کیمسٹری میں قرن ماضی نے جو کچھ ہمیں دیا اس نے وہ سارے اسباب فراہم کردئے جو سائنٹزم کے انہدام کے پیچھے کام کررہے ہیں۔ آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ یہ انہدام کس طرح ہوا۔

اس جھوٹی، مصنوعی اور زہریلی سائنس کے خلاف پہلا زبردست قدم فلسفہ وجودیت کے عالم کارل یاسپرز KARL JASPERS[2] نے اٹھایا۔ انہوں نے تحلیل نفسی Psychoanalysis پر شدید حملہ کرکے یہ بتایا کہ اس دور کے بوکھلائے ہوئے انسان کو اس علم کے وہ طریقہ بتادیا ہے جس کی مدد سے اسے انسان بنے رہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یعنی دوسرے الفاظ میں وہ یہ اچھی طرح سمجھ لے کہ اس کا اصل اور صحیح مقام بہیمیت ہے۔ انسانیت نہیں۔ اس تصور نے اس تہذیب کے لئے نہایت ہی بھیانک بربریت کا راستہ کھول دیا۔ غرضکہ یاسپرز نے تحلیل نفسی کی دھجیاں اڑادیں۔ دوسرا زبردست حملہ تحلیل نفسی اور کرداریت پسندی Behaviourism[3] پر جرمن مفکر

---

[1] Personal Knowledge : The University of Chicago Press : 1974: Chapters 12 & 13

[2] Man in the Modern Age : Rounledge & Kegan Paul : London : 1933.

[3] BEHAVIOURISM ہمارے نزدیک سائنٹزم کی ایک نہایت مکروہ اور زہریلی شکل ہے۔ اس نے درپردہ انسان دشمنی کا وہ راستہ کھول دیا اور حقیقی علم کو ذبح کرنے کا وہ طریقہ بتایا جس کے نتائج ہم بیان کرچکے ہیں۔

کارل مانہایم KARL MANNHIEM[1] نے کیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ دونوں مکاتیب فکر میکانکی نفسیات یعنی Mechanistic Psychology کی میکانکی اسکیم کو بروئے کار لاکر انسانی وجود، انسانی شخصیت اور اس کے ہر ہر پہلو کو اس کے تحت لے آنا چاہتے ہیں۔ ہم کو یہاں یہ یاد رہنا چاہئے کہ فرائڈ FREUD[2] کو مذہب کے تصور سے ایک سخت چڑھ ہوگئی تھی۔

مانہایم نے ایک نہایت کاری ضرب لگاکر تحلیل نفسی کی اسکیم کے منطقی ڈھانچے کو منہدم کردینا ضروری سمجھا کیونکہ اس نے انسانی نفسیات کے بعض حقایق کو مسخ کردیا ہے۔ اس کی مصنوعی اصطلاحوں اور مہمل زبان کی وجہ سے نفسیات مفلوج ہوگئی۔ جن باتوں کو فرائڈ نے کہا ان میں سے بیشتر کا واسطہ انسانی فطرت کے حقایق سے قطعاً نہیں ہے۔ مصنوعی زبان کے بارے میں ہم کو یہ بات طبعیات کے پیش نظر و نرہائزنبرگ[3] نے بھی بتائی ہے اور یہ سمجھایا ہے کہ فطری زبان بہت بہتر ہے اور اس کا استعمال ضروری ہے۔

۱۹۵۲ء میں ایف، اے، ہائک (F.A. HAYEK)[4] کی شہرۂ آفاق کتاب THE COUNTER REVOLUTION IN SCIENCE سائنٹزم کے لئے پیام اجل بن کر سامنے آئی۔ اس کتاب نے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اس

---

[1] Ideology and Utopia : Hercourt Brace and Co. New York : 1936

[2] The Future of an Illusion : Rouhledge & Kegan Paul London

[3] Werner Heisenberg : Physics and Philosophy Harper & Brothers New York : 1958 p. 200

[4] The free Press of Glencoe : 1952

[5] Scientism and Values : Von Norsland Co. iNC. New York : 1960.

جھوٹی اور مصنوعی سائنس کو بے نقاب کردیا اور اس کے فریب کو ہمیشہ کے لئے عیاں کردیا۔

متعدد مفکرین ایسے اُٹھ کھڑے ہیں جن کی تحریروں نے ہمیں قطعیت کے ساتھ بتادیا ہے کہ سائنٹزم اس جعلی تہذیب کا وہ ہتھیار ہے جو علم اور انسانیت دونوں کو ختم کرنے کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ ان متعدد حضرات میں

WERKMEISTER, WEAVER, SCHOECK, BERTALANFFY

VIVAS, WIGGINS

قابل ذکر ہیں۔

اقتصادیات کے چوٹی کے مفکر کینز KEYNES نے ہمیں اس اقتصادیات کے بارے میں متنبہ کیا ہے جو اجداد سے ذہن کو مرعوب کرتی چلی آئی ہے۔ یہ صرف بنائی گئی اور محض "Concoction" ہے[1]۔

نفسیات کا ہر طالب علم جو اردو زبان سے مشرف ہے ایک حقیقی علم اور مصنوعی اور جھوٹے علم میں اب تمیز کرنا سیکھ لے اور یہ اچھی طرح اپنے ذہن نشین کرلے کہ اگر وہ اس فرق کو نہ سمجھ سکا تو اس نفسیات کو کبھی آگے نہ بڑھا سکے گا جو اب مستقبل قریب میں انسانیت کی تعمیر نو میں حصہ لینے جارہی ہے۔ ہم آگے چل کر اس کی سہولت کے لئے لفظ "تعمیر نو" کی اچھی طرح وضاحت کردیں گے۔ جس سے یہ سمجھ میں آجائے گا کہ اس میں نفسیات کا علم کیا حصہ لے گا۔ نفسیات میں جن تصورات کو فروغ حاصل ہونے جارہا ہے، ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کرداریت پسندی اور تحلیل نفسی کے ان تصورات سے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے ان کی کتاب General Theory of Employment, Interest and Money خصوصاً صفحہ (pp 297f)

اب ہمیشہ کے لئے گلوخلاصی حاصل کرسکیں گے جنھوں نے انسان کو یا تو ایک مشین بنا دیا ہے یا پھر اس کو جنسی محرکات کی کٹھ پتلی بنا کر رکھ دیا اور نفسیات کو "شکم" اور "زیر شکم" کا ذریعہ بنادیا۔ یا پھر جیسا کہ ڈاکٹر ایرک فروم نے کہا ہے "اشتہار بازی اور سیاسی پروپیگنڈے کے لئے جو زیادہ تر جھوٹ، مکاری اور بددیانتی پر مبنی ہوتا ہے"، اب ہمیں وہ نہج دیکھنا ہے جس پر انسانیت کی تعمیر نو کے امکانات آج روشن ہوچکے ہیں۔ گویا ہمیں اکیسویں صدی کی نفسیات کے امکانات کا جائزہ لینا ہے۔

نفسیات اکیسویں صدی میں

قرن ماضی کے دوسرے حصہ میں جدید طبیعیات کے اثرات نفسیات اور عمرانی علوم تک پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ طبیعیات کے شہرۂ آفاق پروفیسر اوپن ہائمر Oppenheimer نے American Psychological Association کو اپنے ایک صدارتی خطبے میں ماہرین نفسیات کو یہ صاف صاف بتادیا کہ جس طبیعیات کے تصورات کو لے کر وہ چل رہے ہیں اور جن کو وہ اساس بنا کر نفسیات کو وہ سائنس کا جامہ پہنانے میں مصروف ہیں وہ ختم ہوگئی ہے۔ اس انتباہ کو امریکہ کے "دانشور" ماہرین نفسیات نے اس کان سے سن کر اس کان سے اڑا دیا۔ تاآنکہ ہم نے یہ دیکھا کہ انسانیت پسندانہ نفسیات Humanistic Psychology کے آثار ۱۹۶۰ء کے بعد پوری طرح نمایاں ہوگئے اور بالآخر ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان اس مکتب فکر کو American Psychological Association نے اپنی بتیسویں ڈویژن 32nd Division تسلیم کرلیا۔

انسانیت پسندانہ نفسیات نے جس فکر کے لئے راستہ کھولا ہے وہ قرن حاضر میں ایک عظیم انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یہ عظیم انقلاب زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو

اخلاقی اقدار کے راستے سے ان روحانی اقدار سے ملانے جارہا ہے جن کا ماخذ تصور وحدت ہے۔ یہ وہ طویل بحث ہے جس پر قرآن کے فلسفہ سائنس کی روشنی میں ایک کتاب درکار ہے۔

ہم یہاں فی الوقت صرف یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ انسان اور اس کی زندگی اور انسانیت کی تعبیر نو دراصل ہے کیا۔ اس کا نظریہ علم Epistemology سے کیا تعلق ہے اور وہ کس طرح ہوسکے گی۔ پھر ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ نفسیات کا اس میں کیا حصہ Role ہوگا۔

لیکن اس سے پہلے ہم ایک مختصر سا جائزہ یہ لیں گے کہ اس مکتب فکر کو علاوہ جدید طبیعیات کے اور کن فکری قوتوں نے آگے بڑھایا۔ ان میں ایک زبردست فکری قوت فلسفہ وجودیت Existentialism ہے[1] اس میں خصوصاً یاسپرز Jaspers اور ہائی ڈیگر Heidegger اور نیز مارسل Marcel کی تحریروں میں ہمیں وہ تصورات ملتے ہیں جنھوں نے خصوصاً معالجاتی نفسیات کے میدان میں انسانیت پسندانہ فکر کو بہت گہرا متاثر کیا ہے۔ یوں تو اس مکتب فکر کے ساتھ نیطشے (Nietzsche) کیرکی گارڈ (Kierkgaard) اور پاسکل (Pascal) بھی وابستہ ہیں[2] نیز سارتر (Sartre) بھی لیکن مجموعی طور پر جو اثرات انسانیت پسندانہ نفسیات میں آئے ہیں اس میں مذکورہ بالا تین مفکرین کو بڑا دخل ہے۔

---

[1] David E Roberts ; Existentialism and Religious Belief ; Oxford University Press ; New York ; 1959.

[2] H.J Blackman ; Six Existentialist Thinkers ; Rouhledge and Kegan Paul ; London 1951.

ہائڈیگر Heidegger نے اس بات کو تسلیم کرلیا کہ مغربی تہذیب روحانی اعتبار سے دیوالیہ ہوچکی ہے۔ چنانچہ اقدار کو ان کی ماورائیت میں لے آنا ضروری ہے[1]

'Western Civilization had become Spiritually bankrupt and that a radical transvaluation of values was needed.'
[p. 149.] [David & Roberts : Ibid]

مارسل (Marcel) نے اس بات پر زور دیا ہے کہ انسانیت بربریت کے مقام پر اس لئے پہنچ گیا کہ اس نے زندگی کے اس "تقدس" کو مٹادیا جو اس کو انسان بناتا ہے۔

یاسپرز (Jaspers) کے خیالات کی وسعت اور گہرائی کو سمجھنے کے لئے انہیں قرآن کی روشنی میں دیکھنا ہوگا۔ اس کا کہنا ہے یہ تہذیب بوکھلائے ہوئے انسانوں کی ایک بھیڑ ہے۔ ذرائع کو مقاصد بنالیا ہے۔ یاسپرز کے خیالات کی گہرائیوں میں اتر کر مولانا روم کا یہ شعر یاد آتا ہے:

ہر ہلاک امت پیشیں کہ بود   زانکہ بر جندل گماں بردند عود

---

[1] ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اگر ۲۰۰۵ء تک جدید طبیعیات کے بعض نتائج کو اور فلسفہ وجودیت اور ہیومنزم (Humanism) اور ۱۹۸۵ء سے ۲۰۰۰ء تک کے Frontier Sciences کے بعض نتائج کو اگر قرآن کے ہمہ گیر فکر میں سمولیا گیا تو اس تہذیب کے آثار بالکل نظر آنے لگیں گے جو آدمی کو انسان بنا کر اس کے وہ مقامات دکھادے گی جو خود اسی کی فطرت کا راز ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خالق انسان کی مشیت ان کو پورا کرنا چاہتی ہے۔ خواہ وہ اس کو کسی عالمگیر تباہی سے ہی کیوں نہ گزارے۔ لیکن یہ کام کسی ایک آدمی کے بس کا نہیں ہے۔

جاحظ ماہر حیوانیات

کی حیثیت سے

از جناب عبدالرحمٰن شریف صاحب ٭

عربی زبان کے ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے جاحظ کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، اس کی شاہکار ادبی تصانیف عربی زبان و ادب کے نصاب میں شامل ہیں اور بلاشبہ وہ عربی زبان کے دو یا تین سب سے بڑے ادیبوں اور نثر نگاروں میں سے ایک ہے۔ اپنی ان یگانہ خصوصیات اور مستشنی خوبیوں کے علاوہ جاحظ بہت بڑا سائنسداں بھی تھا۔ اس نے حیوانیات (ZOOLOGY) پر ایک جامع کتاب لکھی۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے علماء نے اس کے سائنسی کارناموں کی طرف کوئی اعتنا نہیں کیا۔ یہ کام کسی حد تک مغربی عالموں نے کیا ہے۔ اس مختصر مضمون میں ماہر حیوانیات کی حیثیت سے جاحظ کا ایک اجمالی تعارف پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جاحظ ایک بہت بڑا ماہر حیوانیات تھا جس کی شہرۂ آفاق کتاب الحیوان کو حیوانیات کی تاریخ میں ایک اہم اور ممتاز درجہ حاصل ہے۔ حیوانیات میں اس نے جو بے مثال کارنامے انجام دئے ہیں ان کی بنا پر اسے دوسری صدی عیسوی سے سترہویں

٭ اے/۲، نیو پریم واسندھرا، مہاکالی روڈ، اندھیری، ممبئی۔

صدی عیسوی تک کے پندرہ سو سالوں میں سب سے اہم ماہر حیوانیات تسلیم کیا جاتا ہے۔ ارسطو سے (۳۲۲ ق م) ڈے بفون (۱۷۰۳) تک کوئی دوسرا ماہر حیوانیات (ZOOLOGIST) جاحظ کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ کتاب الحیوان کو حیوانیات پر اسلامی لٹریچر کی سب سے اہم تصنیف سمجھا جانا چاہئے، کیونکہ کسی دوسری اسلامی کتاب میں کتاب الحیوان جیسی گہرائی اور گیرائی نہیں پائی جاتی۔

کتاب الحیوان کے جس حصے میں چیونٹیوں کا بیان ہے یا جن میں دریائے دجلہ کی مچھلیوں کا بیان ہے کسی بھی جدید ماہر حیوانیات کو دنگ کرنے پر مجبور کرسکتے ہیں۔

جاحظ نے حیوانیات کے کئی اہم موضوعات کا مطالعہ کیا ہے جیسے حیوانوں کا ارتقاء (OVOLUTION) ان پر ماحول اور موسم کے اثرات ایک جگہ سے دوسری جگہ جانوروں کا ہجرت کرنا (MIFRATION) ان کی زبان اور نفسیات۔ ان میں سے بیشتر موضوعات پر مغرب نے ابھی پچھلی چند صدیوں میں کہیں جاکر توجہ کی ہے۔ یعنی جاحظ سے کوئی ایک ہزار سال بعد۔

یہ صحیح ہے کہ جاحظ نے جانوروں کا مطالعہ خالص سائنسی نقطۂ نظر سے نہیں کیا ہے، بلکہ اس پر دینی، تاریخی، سماجی اور ادبی رنگ چھایا ہوا ہے۔ لیکن اس سے اس کی سائنسی اہمیت کم نہیں ہوسکتی۔ کتاب الحیوان جانوروں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔

کتاب الحیوان ایک ضخیم کتاب ہے جس کی سات جلدیں چھپی ہیں لیکن پھر بھی یہ نامکمل ہے۔ اس میں تقریباً چار سو جانوروں کا ذکر ہے جن میں چھوٹے بڑے پالتو اور جنگلی جانور، پرندے، کیڑے مکوڑے، مچھلی، سانپ اور دوسرے رینگنے والے جانور شامل ہیں۔ لیکن

اس میں وہ جانور شامل نہیں ہیں جن کے بارے میں جاحظ کے زمانے کے عربوں کو واقفیت تھی۔ قرآن، حدیث اور دوسری عربی کتابوں میں تقریباً ایک ہزار جانوروں کا ذکر پایا جاتا ہے۔

اسلام میں فطرت کا مطالعہ گویا ایمان کا ایک جزء ہے کیونکہ کائنات کی ہر شئے زمین، آسمان، ستارے، سیارے، انسان، فرشتے، نباتات وحیوانات خدا کی قدرت اور حکمت کے مظہر ہیں اور ان کے مطالعہ سے انسان خدا کو پہچان سکتا ہے۔ چنانچہ جاحظ نے لکھا ہے کہ حیوانات میں خدا کی قدرت اور ربوبیت کے عجیب وغریب آثار و مظاہر پائے جاتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے قرآن مجید کی متعدد آیتوں کا حوالہ دیا ہے۔

حیوانیات کے مطالعہ میں جاحظ نے اپنے پیشروؤں خصوصاً یونانی سائنسدانوں سے کافی استفادہ کیا ہے لیکن اس سے نہ کتاب الحیوان کی اہمیت کسی طرح کم ہوتی ہے بلکہ یہ بالکل ہی اوریجنل (ORIGINAL) کتاب معلوم ہوتی ہے۔ اس نے خود لکھا ہے کہ اسے ارسطو سے استفادہ کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں ہوئی کہ جو کچھ وہ جانتا تھا اس سے عرب بدو بخوبی واقف تھے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے جاحظ نے کتاب الحیوان میں تقریباً چار سو جانوروں کا ذکر کیا ہے۔ یہاں پر چیونٹیوں کے بارے میں اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس نے چیونٹیوں کے مطالعہ میں کس قدر دلچسپی مگر صبر، مشقت، دقت نظر اور باریک بینی سے کام لیا تھا۔

چیونٹیوں کی زبان | ایک چیونٹی ایک مری ہوئی ٹڈی کے پاس پہنچ کر اسے اِدھر اُدھر لڑھکانے

آگے بڑھانے اور کھینچ لے جانے کی کوشش کرتی ہے اور جب وہ اس ٹڈی کو کھینچ لے جانے میں کامیاب نہیں ہوتی تو وہ اپنے گھر لوٹ جاتی ہے۔ مشاہدہ کرنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ وہ بہت جلد چیونٹیوں کی ایک لمبی قطار کے ساتھ لوٹتی ہے اور وہ سب مل کر اس مردہ ٹڈی کو اپنے گھر کھینچ لے جاتی ہیں۔

اب ہم یہ کیسے مان لیں کہ جو چیونٹی دوسری چیونٹیوں کو لے کر آتی ہے وہ وہی چیونٹی ہے جو پہلے مردہ ٹڈی کو کھینچنے میں ناکام ہوئی تھی اور وہی اپنے ساتھیوں کو اس ٹڈی کے بارے میں بتا کر انہیں ساتھ لائی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا تجربہ بتاتا ہے اور ہم نے ہمیشہ یہ دیکھا ہے کہ جب کوئی چیونٹی ٹڈی کو کھینچنے میں ناکام ہوتی ہے تو اپنے گھر جاتی ہے اور دوسری چیونٹیوں کو ساتھ لے کر لوٹتی ہے۔ اگر ہم اس چیونٹی کو نہ پہچان سکیں اور اسے دوسری چیونٹیوں سے ممیز نہ کر پائیں تب بھی ہمارا تجربہ اس کا معقول جواب ہے۔

ہم نے بوجھ کے ساتھ یا بغیر بوجھ کے گھر لوٹتی ہوئی ایسی کوئی چیونٹی نہیں دیکھی جو راستے میں رک کر دوسری چیونٹیوں سے بات چیت کئے بغیر چلی جاتی ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری چیونٹی ناکامی کے بعد دوسری چیونٹیوں کو مردہ ٹڈی کے بارے میں بتاتی ہے اور انہیں اس کے پاس لے جاتی ہے۔

چیونٹیوں کی عقل | چیونٹیوں کی عقل اور دوراندیشی کے بارے میں جاحظ رقمطراز ہیں: چیونٹیاں موسم گرما میں یا جب اناج کی فراوانی ہوتی ہے، اناج محفوظ کر لیتی ہیں، تاکہ اسے سرما میں، یا جب اناج نہ ملے، یا جب آمد ورفت میں دقت ہو تب اسے استعمال کر سکیں۔ ان کی سمجھ داری اور دوراندیشی اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ زمین کے اندر رکھنے

اناج کے دانے سڑ گل سکتے ہیں اس لئے وہ محفوظ کئے ہوئے اناج کو بل سے باہر نکال کر سکھانے کے لئے رکھ دیتی ہیں اور اس کے بعد اپنے گھر میں لے جاتی ہیں۔

محفوظ کئے ہوئے اناج کے دانوں سے کونپلیں پھوٹنے (GERMINOTION) کا خدشہ ہوتا ہے۔ خصوصاً جب جگہ نم ہو۔ اس سلسلے میں چیونٹیاں جو حفاظتی اقدام کرتی ہیں وہ نہایت قابل ستائش ہے۔ وہ اناج کے دانوں کو توڑ کر انہیں دو حصوں میں بانٹ دیتی ہیں تاکہ ان سے کونپلیں نہ پھوٹیں گویا اس معاملے میں وہ انسانوں سے بھی زیادہ سمجھداری کا ثبوت دیتی ہیں۔

جاحظ نے حیاتیات (BIOLOGY) کے چند بنیادی مسئلوں پر بھی غور کیا تھا جیسے جانوروں میں زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کا مادہ (STRUGGL-EFOV SURVIVAL) اور نئے ماحول میں جینے کی صلاحیت (ADAPTION) انہوں نے بغداد کے دریائے دجلہ میں پائی جانے والی مچھلیوں کے بغور مطالعہ و مشاہدہ سے یہ ثابت کیا کہ ماحول کی تبدیلی سے جانوروں کی زندگی اور ان کے عادات و اطوار میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ جاحظ پہلا سائنسداں ہے جس نے جانوروں کی زندگی میں موسم اور ماحول کی اہمیت کا ذکر کیا ہے۔

علم حیاتیات کی ایک ضرورت حیوانات کے انواع (CLASSIFICATION) متعین کر کے انہیں مخصوص انواع و طبقات میں بانٹنا ہے تاکہ مطالعہ میں آسانی ہو۔ جاحظ نے اس مسئلہ پر بھی قلم اٹھایا۔ اس طرح کے حیاتیاتی انواع کا مطالعہ قدیم یونانی سائنسداں اور فلسفی ارسطو نے بھی کیا تھا۔ لیکن جاحظ نے ارسطو کے بنائے ہوئے نظام کو قبول نہیں کیا بلکہ ایک نیا نظام ترتیب دیا جو جانوروں کے حرکت کرنے کے انداز پر

مبنی تھا۔

سب سے پہلے اس نے موجودات کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا۔ جماد (INORGONIC) اور نامی (ORGANIC) پھر نامی کو نباتات اور حیوانات میں تقسیم کیا۔ حیوانات کی چار مزید قسمیں بتائیں جو ان کے حرکت کرنے کے طریقے پر مبنی تھیں۔ (۱) ماشی (جو جانور زمین پر چلتے یا دوڑتے ہیں) اس میں انسان بھی شامل ہے (۲) طائر (اڑنے والے جانور یعنی طیور) (۳) سباح (پانی میں تیرنے والے جانور) اور (۴) دواب (رینگنے والے جانور)

جاحظ نے اس تقسیم کو جامع نہ قرار دے کر اپنی سائنسی سوجھ بوجھ اور علمی دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔

جاحظ نے جانوروں کو کارآمد اور بے کار کے خانوں میں تقسیم کرنے سے گریز کیا ہے۔ اس کے نزدیک تمام جانور خواہ وہ خونخوار درندے اور انسان کو ضرر پہنچانے والے ہی کیوں نہ ہوں۔ خدا کے تخلیقی نظام میں اپنا ایک درجہ رکھتے اور اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ نظام تخلیق اور اس کے موجودات میں ایک باہمی ربط و رشتے کا قائل تھا۔ ڈی این اے (DNA) کے سلسلے میں جدید سائنس نے جو تحقیق و دریافت کی ہے اس کی روشنی میں جاحظ کے اس خیال کی سچائی ثابت ہو رہی ہے۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جاحظ کے حالات اور فضل و کمال کا مختصر تذکرہ کر دیا جائے۔

ابو عثمان عمر بن بحر بن محبوب جاحظ کی پیدائش ۱۵۹ھ/۷۷۶ء میں جنوبی عراق کے شہر بصرہ میں ہوئی۔ وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے دادا اونٹ

چراتے تھے۔ جاحظ کو خود بھی گزربسر اور معاش کے لئے کچھ عرصہ تک سڑک پر روٹی اور مچھلی فروخت کرنی پڑی تھی۔ لیکن اسے علم حاصل کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ ابو ہفان نے لکھا ہے کہ میں نے اس سے زیادہ علم و مطالعہ کا شائق نہ کسی کو دیکھا نہ سُنا۔ اپنے دور کے مشہور علماء اس کے استاد رہے ہیں۔ جیسے الاصمعی، ابو عبیدہ اور ابو زید وغیرہ۔ اس کے اکثر اساتذہ عربی زبان و ادب کے ماہر تھے اس لئے اسے بھی زبان و ادب اور عربیت میں غیر معمولی تبحر حاصل ہوا۔

وہ بڑا بدصورت تھا اور اس کی بدصورتی کے کئی واقعات مشہور ہیں۔ بغداد کی ایک عورت ایک مصور کے پاس گئی اور اس سے کہا کہ وہ اس کے لئے شیطان کی تصویر بنادے۔ مصور نے کہا جب میں نے شیطان کو نہیں دیکھا تو اس کی تصویر کیسے بناؤں؟ عورت نے کہا: کیا تم نے جاحظ کو نہیں دیکھا، بس اسی کی تصویر بنادو۔

تعلیم سے فراغت کے بعد خلیفہ المامون کے دور میں وہ بغداد آیا اور کچھ عرصہ سامرا میں بھی گزارا۔ لیکن اس نے کوئی سرکاری عہدہ یا سرپرستی قبول نہیں کی۔ اس کی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں تھا۔ درس و تدریس اور تصنیف ہی ذریعۂ معاش تھا۔ کتابوں کی نقل سے بھی اس کی اچھی آمدنی ہوجاتی تھی۔ اس کے کئی دولت مند مربی بھی تھے۔ جیسے بغداد کے قاضی احمد بن ابی داؤد۔ جاحظ نے اپنی دوسری شہرۂ آفاق کتاب البیان والتبیین انہی کے نام معنون کی تھی۔ دینی اور سیاسی امور میں وہ ثمامہ بن اشرس اور النظام کا مقلد تھا۔ خود معتزلی تھا اور معتزلہ کے ایک فرقہ کا بانی بھی تھا جو الجاحظیہ کہلاتا ہے۔

زندگی کے آخری برسوں میں وہ اپنے وطن بصرہ لوٹ آیا جس سے اس کو بے حد لگاؤ تھا مگر اس کے آخری ایام بڑی اذیت میں گزرے کیونکہ ضعیفی کے علاوہ وہ چند خطرناک

بیماریوں میں مبتلا ہوگیا تھا۔ مثانہ میں پتھری تھی اور فالج سے آدھا جسم اس قدر بے جان ہوگیا تھا کہ تیز چاقو سے کاٹنے پر بھی اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں دوسرا حصہ اس قدر حساس تھا کہ ایک مکھی بھی بیٹھتی تو شدید درد ہونے لگتا تھا۔ اسی کرب و الم میں پنچانوے[۹۵] سال کی عمر میں محرم ۲۵۵ھ/۸۶۸ء میں اس کا انتقال ہوا۔ ایک تذکرہ نویس نے لکھا ہے کہ جاحظ کو ایک سچے عاشق کتب کی موت نصیب ہوئی۔ وہ اپنے کتب خانے میں بیٹھا مطالعہ میں مشغول تھا کہ کتابوں کا ایک بڑا ڈھیر اس کے بیمار اور لاغر جسم پر آگرا جس کے نیچے دب کر اس کی موت واقع ہوگئی۔

جاحظ ممتاز مصنف اور کثیر التصانیف تھا۔ اس نے دو سو سے زیادہ کتابیں لکھیں بعض مورخوں نے اس کی کتابوں اور رسائل کی تعداد تین سو سے زیادہ بتائی ہے۔ ان میں سے تقریباً اسّی کتابیں آج بھی موجود ہیں جن میں علی الخصوص حیوانیات، علم الانسان، طب، جغرافیہ، الٰہیات، سیاسیات اور ادب پر بحث و گفتگو کی گئی ہے۔ بعض مشہور اور اہم کتابوں کے نام یہ ہیں: کتاب الحیوان، کتاب البیان والتبیین، کتاب العثمانیہ، کتاب البخلا اور المحاسن والاضداد۔

خواجہ حافظ شیرازی
اور
محمد قلی قطب شاہ

ڈاکٹر عبدالرب عرفان ٭

خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی (وفات: ۷۹۲ھ = ۱۳۹۰ء) کو فارسی کے پیمبران سخن میں شمار نہیں کیا گیا لیکن اس سے ان کے سخنورانہ مقام اور عظمت و رفعت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا کیونکہ وہ تو خدائے سخن تھے۔ اس حقیقت سے کسی کو مجال انکار نہیں ہو سکتی کہ فارسی شاعری کی تاریخ نے ان سے بڑا اور ان سے زیادہ خوش فکر شاعر پیدا نہیں کیا۔ ان کا رنگ کلام سب سے مختلف اور ان کا طرز بیاں سب سے منفرد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد شعراء کی تقلید کے مورد قرار پانے کے باوجود ان کی تقلید کے کامیاب نمونے نایاب نہیں تو نادر الوجود ضرور ہیں۔

حافظ آٹھویں صدی ہجری یا چودھویں صدی عیسوی کے عظیم فاتح امیر تیمور (ولادت: ۷۳۶ھ = ۳۶-۱۳۳۵ء، جلوس: ۷۷۱ھ = ۷۰-۱۳۶۹ء، وفات: ۸۰۷ھ / ۵-۱۴۰۴ء) کے ہم زماں تھے۔ اگر "خداداد لطف سخن" کے اوصاف سے متصف شاعری کو مملکت سے اپنے دل نشین کلام سے دلوں کو مسخر کرنے والے شاعر کو فرمانروا سے اور روز افزوں

٭ غالب روڈ، وارث پورہ، کامٹی۔

شہرت و مقبولیت کو استعارے کے بطور توسیع مملکت اور سلسلہ فتح و ظفر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ حافظ مملکت سخن کے شہنشاہ تھے اور تیمور سے بڑے فاتح۔ تیمور جس مملکت کا فرمانروا تھا وہ جغرافیائی حدود میں محدود تھی اور زوال و انحلال اس کا مقدر۔ چنانچہ اس کی مملکت کو مٹے صدیاں گزر گئیں لیکن حافظ کی مملکت نہ صرف ہنوز برقرار ہے بلکہ تفتیح و توسیع کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ان کی حیات اور ان کے عقائد و افکار پر جن محققین اور منتقدین نے حافظ شناسی میں گراں ارز اضافے کیے ہیں ان کے ناموں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اب بھی نہ جانے کتنے محققین ان کی زندگی اور شاعری کے نامعلوم حقایق کی دریافت اور معلوم حقائق کے نامعلوم گوشوں کی بازیافت میں پورے انہماک کے ساتھ مصروف کار ہیں۔

حافظ کبھی ایران کے جغرافیائی حدود سے باہر نہیں نکلے لیکن اپنے شعر سے عراق و فارس فتح کرنے کے بعد بغداد اور تبریز پر اپنا تسلط جمانے کا عزم رکھنے کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

عراق و فارس گرفتی بشعر خوش حافظ   بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریز ست[۱]

حافظ کا شمار ان خوش نصیب شعرا میں کیا جاتا ہے جن کی شہرت اور مقبولیت عالمگیر ہے۔ ہندوستان سے حافظ کا رابطہ ان کی زندگی ہی میں قائم ہو گیا تھا۔ یہ بات خود حافظ کے دیوان سے پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ انہوں نے بنگالہ کے حکمراں سلطان غیاث الدین بن سکندر (وفات: ۸۱۲ھ = ۱۴۰۹ء) کے پاس ایک غزل روانہ کی تھی جس کا ایک بہت مشہور شعر مقطعے کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے:

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند   زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دیں   غافل مشو کہ کار تو از نالہ میرود[۲]

یہ حقیقت بھی تاریخ سے ثابت ہے اور بہت مشہور ہے کہ دکن کے بہمنی فرمان روا سلطان محمد ثانی بہمنی (وفات: ۷۹۹ھ = ۱۳۹۷ء) نے حافظ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی۔ خواجہ صاحب اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے بندر ہرمز تک آئے بھی اور جہاز پر سوار بھی ہو گئے لیکن ابھی جہاز کا لنگر اٹھایا بھی نہیں گیا تھا کہ باد مخالف سے سمندر میں طوفان آ گیا۔ خواجہ صاحب کی طبع نازک پر اس کا برا اثر پڑا۔ وہ فی الفور جہاز سے اتر پڑے اور معذرت کے بطور ایک غزل سلطان کی خدمت میں روانہ کر دی جس کے دو شعر بطور ذیل ہیں:

دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد | بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد
شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں درو درجست | کلاہ دلکش است اما بترک سر نمی ارزد[۴]

سیاسی تاریخ کا یہ لمحہ ہندوستان کے خطہ دکن سے حافظ کے معنوی ربط کا نقطہ آغاز ہے اور سلطان محمد قلی قطب شاہ (ولادت: ۹۷۱ھ = ۶۴-۱۵۶۳ء، جلوس: ۹۸۸ھ = ۱۵۸۰ء، وفات: ۱۰۲۰ھ = ۱۶۱۲ء) کا عہد اس کا نقطہ عروج اور منتہائے کمال۔ سلطان محمد قلی فارسی، دکھنی (اردو) اور تیلگو زبانوں کا شاعر تھا۔ فارسی میں قطبشہ اور دکھنی میں معانی تخلص کرتا تھا۔ اس کی دکھنی غزلوں میں عاشقی، رندی، شوخی، سرمستی اور تصوف کا رنگ حافظ سے اثر پذیری کا نتیجہ ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بے انتہا عاشق مزاج تھا۔ اس کی متعدد محبوبائیں تھیں۔ ان میں سے مشہور ترین بھاگ متی تھی جس کے نام سے اس نے شہر بھاگ نگر آباد کیا تھا۔ بعد میں اس خوش بخت کو حیدر محل کے خطاب سے سربلند کر کے اس نئے خطاب کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے شہر بھاگ نگر کا نام بدل کر حیدر آباد کر دیا۔ ممکن ہے اس کے لئے عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ رہا ہو۔ اس کے کلیات[۵] کے

حصہ غزلیات میں ایسے اشعار کم نہیں جن میں اس نے اپنے صوفی صافی ہونے کا ادعا کیا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں کئی پہلوؤں سے خواجہ حافظ کی شاعری سے اثر پذیری کی مثالیں فراوانی سے ملتی ہیں۔ حافظ کی شاعری کے عناصر جن سے اس کا خمیر اٹھا ہے عشق رندی و سرمستی، آزاد خیالی، خوش باشی، تصوف اور دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی کم بقائی سے عبارت ہیں۔ کم و بیش یہی عناصر قطب شاہ (قطبشہ) کی غزلوں اور شعروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے یہاں عشق کے دونوں رویے (حقیقی اور مجازی) پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ مجازی عشق کی مثالیں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے اپنی متعدد محبوباؤں کے بارے میں اپنے جذبات و محسوسات کا جو اظہار کیا ہے وہ اس کے مجازی عشق کا اظہر من الشمس (سورج سے زیادہ روشن) پہلو ہے۔ حقیقی عشق سے وابستگی کے دعوے اپنی غزلوں میں کثرت سے کئے ہیں۔ بعض غزلیں تو صرف اسی موضوع پر لکھی ہیں۔ مثلاً کلیات کے دوسرے حصے کی غزل نمبر ۲۴۸ ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں صرف مطلع اور مقطع نقل کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے:

آج کل نیں تھا ازل سے عشق کا مکتب منجے | تو ابد لگ یوں پھبیا ہے عشق کا مذہب منجے[۶]

(آج کل سے نہیں بلکہ ازل سے مجھے عشق کا مکتب بھا گیا ہے اور ابد تک اسی طرح عشق کا مذہب پسند آئے گا مجھے)

عشق سوں بولیا غزل حضرت نبی صدق قطب | صافی کے اوصاف میں لگے صوفی کے مشرب منجے[۷]

(عشق میں اس نے غزل کہی یا حضرت نبی قطب آپ پر صدقے۔ صاف دلی کے اوصاف میں میرے مشرب کو صوفی کا مشرب کہتے ہیں)

میں فاش کیوں نہ ہو سکی تج عشق تھے دو جگ منے | منصور سا عاشق ہوا آکر سو تیرے دار فاش[۸]

(اے سکھی میں تیرے عشق میں دونوں دنیا میں مشہور کیوں نہ ہوتا۔ منصور عاشق تیرے دار (دوار) پر آکر مشہور ہوا۔)

حافظ فرماتے ہیں :

در وفائے عشق تو مشہور خوبانم چو شمع شب نشین کوے سربازان و رندانم چو شمع[9]

حافظ کی طرح قطبشہ کو بھی ظاہر پرستی اور ریاکاری سے نفرت ہے حافظ نے تو یہ کہہ کر :

مے خور کہ شیخ و واعظ و مفتی و محتسب چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند[10]

اپنے زمانے کے دین داروں، دین پناہوں اور شریعت مداروں کے چہرے سے تقویٰ اور پارسائی کی نقاب نوچ لی ہے۔ حافظ کی پیروی میں قطبشہ نے بھی مکاروں اور ریاکاروں کے قول و فعل کے تضاد کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ایک شعر میں کہتا ہے :

مرید پیر میخانہ ہوا ہوں دیکھ اے زاہد ہماری مے پرستی میں تمن تسبی ریا ہے اب[11]

"(تمن تسبی یعنی تمہاری تسبیح) اسی رنگ و آہنگ کے چند شعر اور ملاحظہ فرمائیں :

معانی ریا ترک کن عیش سوں اچ کہ سنتریا ہے تج ہات آنچل سزوش[12]

(معانی ریا ترک کر عیش سے رہ کہ تیرے ہاتھ ایک سانولی سلونی کا آنچل آگیا ہے)

صباحی او مکھ دیکھ پینا شراب فرح بخش ساعت میں پینا شراب[13]

(صبح کے وقت اس چہرے کو دیکھ کر شراب پینا۔ فرح بخش ساعت میں شراب پینا)

کہاں کیخسرو و دارا و سکندر و جمشید دل پیالے میں بھریا ساقی شراب لبریز[14]

(کیخسرو، دارا اور سکندر کہاں ہیں (یعنی ملک عدم چلے گئے) اے ساقی تو دل کے پیالے میں شراب لبالب بھر)

سورج من پیالے میں ساقی شراب پور کر موغم دیرسالہ کوں یک دو قدح سوں دور کر[15]

(سورج جیسے پیالے کو اے ساقی شراب سے پُر کر۔ میرے پرانے غم کو ایک دو قدح سے دور کر)

قطب شاہ اپنے شاعرانہ مسلک میں حافظ کا پوری طرح مقلد تھا۔ اس نے حافظ کے انداز فکر، رنگ کلام اور یہاں تک کہ حافظ کی ترکیبوں کو بھی اپنا کر اپنی دکھنی شاعری کا جزو بنا دیا، اس کے سرمایہ سخن میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جو حافظ سے قطبشہ کی جزوی یا کلی خوشہ چینی کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں :

حافظ	قطبشہ
المنۃ للہ کہ در میکدہ باز است	دیکھیا ہوں سُنہ کہ میخانے کا ہوا دباز
زاں رو کہ مرا بر در او روے نیاز است	کروں گا شکر گزاروں گا سو دوگانہ نماز
اگر دشنام فرمائی وگر نفریں دعا گویم	گالیاں ستے او نازنیں مجہ یاد کرتا کر سنیا
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خا را	اب دل کروں قربان اس دشنام کے انعام پر
حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو	دنیا کا حکمت نا بوجھیں ہرگز حکیماں علم سوں
کہ کس نگشود و نگشاید بحکمت ایں معما را	گاؤ ترنا عیش کار نس دن پیا کے نام پر
کشتی شکستگانیم اے باد شرطہ برخیز	ہیں بیٹھے ہیں غم کشتی منے باد موافق کاں
باشد کہ باز بینیم دیدار آشنا را[16]	صبا توں باد طالب لیا کر جنگ طوفاں سوں کرتے میں[17]

حافظ کے دیوان کی غزل "اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را ... الخ" کے دوسرے شعر میں "مے باقی" کی ترکیب آئی ہے جس کا مطلب ہے "بچی ہوئی شراب" (صوفیہ کے نزدیک دائمی بقا عطا کرنے والی یعنی معرفت کی شراب) قطبشہ نے "باقی" کا ترجمہ "اُبار یا جام" کیا ہے اور "ابارنا" بچانا یعنی پس انداز کرنا اور بچانا یعنی مصیبت سے نجات دلانا اور حفاظت

کرنا دونوں معنوں میں آتا ہے[18] لہذا قطبشہ کے یہاں "اُبار یا جام" بچی ہوئی شراب کے معنوں میں آتا ہے۔

عشق ایک پہیلی ہے۔ اس کی حقیقت کی تہ تک پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں اس سلسلے میں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ "ڈوبنے والے کو ساحل کی خبر ہوتی ہے"۔ حافظ نے راز دہر کو ایک معما کہا ہے اور اس معمے کا پیچیدہ ترین نکتہ عشق ہے۔ شاید اسی لئے قطبشہ کہتا ہے:

کرے کن دلیل و دلائل سوں عشق   دلیلاں میں ہلجے ہیں عالم ہزار[19]

ہلجے ہیں یعنی الجھے ہیں۔

قطبشہ کے یہاں صرف ایسے اشعار ہی نہیں پائے جاتے جو حافظ سے اثر پذیری کا نتیجہ ہیں بلکہ بعض روایتوں کے مطابق اس نے حافظ کی پچاس غزلوں کا دکھنی اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ غزلیات حافظ کا پہلا مترجم قرار پاتا ہے۔ تمام ترجمہ شدہ غزلوں کی دریافت اور بازیافت نہایت مشکل اور دقت طلب کام ہے لہذا چند غزلیں حافظ کی غزلوں کے ساتھ بطور نمونہ نقل کی جاتی ہیں:

حافظ	قطبشہ
گل بے رخ یار خوش نباشد	پھل بن رخ یار خوش ندیسے
بے بادہ بہار خوش نباشد	بن مد کھلی جھاڑ خوش ندیسے
طرف چمن و طواف بستان	گشت چمن و ہوائے کلیاں
بے لالہ عذار خوش نباشد	بن پیا بہ کنار خوش ندیسے
رقصیدن سرو و حالت گل	ناچے و نا سرو اب سو حالت
بے صوت ہزار خوش نباشد	بن ناد ہزار خوش ندیسے
با یار شکر لب گل اندام	مو یار شکر بنب و چنپا رنگ
بے بوس و کنار خوش نباشد	بن چمن پیار خوش ندیسے
باغ و گل و مل خوش است لیکن	باغ و پھل و جل ہے تو آ
بے صحبت یار خوش نباشد	بن صحبت یار خوش ندیسے
ہر نقش کہ دست عقل بندد	ہر چتر کہ جگ کی عقل بندے
جز نقش و نگار خوش نباشد	بن چتر نگار خوش ندیسے
جاں نقد محقر است حافظ	جیت نقد چکارہ ہے معانی
از بہر نثار خوش نباشد[20]	اس تائیں نوار خوش ندیسے[21]

حافظ	قطبشہ
آنکس کہ بدست جام دارد	جے کو کہ ہتیلی جام لینیا
سلطانی جم مدام دارد	سلطانی جسم مدام لیبا
آبے کہ خضر حیات ازو یافت	پانی کہ خضر حیات پایا
در میکدہ جو کہ جام دارد	مدگھر تھے تنک سو جام لینیا
سررشتۂ جاں بجام بگذار	سر دھاگہ جی سو کام دا کھو
کایں رشتہ ازو نظام دارد	اے دھاگہ کہ اسوں نظام لیبیا
مادے وذاہدان وتقویٰ	میں دمر و عاقلان و تسبی
تا یار سرِ کدام دارد	مو یار کن تھے دام لیبیا
بیرون ز لب تو ساقیا نیست	باہر تو اَدھر تھے ساقیا نا

در دور کسے کہ کام دارد — اس دور کنے کہ کام لیبا
نرگس ہمہ شیوہ ہائے مستی — لوچن ترے شیوہ ہائے مستی
از چشم خوشت بوام دارد — او دِشٹ پچھل تھے دام لیبا
ذکر رخ و زلف تو دلم را — ذکر رخ و زلف تج ہمن دل
دردیست کہ صبح و شام دارد — پوجن سو صبح و شام لیبا
بر سینۂ ریش دردمنداں — مو سینۂ داغ درد دکھوں
لعلت نمکے بتمام دارد — رو پوں نمکی بتمام لیبا
در چاہ ذقن چو حافظ اے جاں — او چاہ ٹھڈی معانی کی جاں
حسن تو دو صد غلام دارد[۲۲] — تو حسن دو سو غلام لیبا[۲۳]

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور — یوسف گم سو پھر آگا اب بکنعاں غم نکھا
کلبۂ احزاں شود روزے گلستان غم مخور — گھر ترا امید کا ہوگا گلستاں غم نکھا
اے دل غمدیدہ حالت بہ شود دل بد مکن — اے ہیا نیہ دکھ دکھیا سو خوب ہوگا حال تج
ویں سر شوریدہ باز آید بسامان غم مخور — من کا چنتا ہوئیگا پھر آکہ جاناں غم نکھا
گر بہار عمر باشد باز بر تخت چمن — جم بہار عمر تج ہے پھر کہ آگا باغ میں
چتر گل در سر کشی اے مرغ خوشخواں غم مخور — چتر پھُل کا کھلک دکے، رنگیں مرغ خوش خواں غم نکھا
دور گردوں گر دو روزے بر مراد ما نرفت — بر ہے کہاوے دو دن تھا دور اپنے پیو تھے
دایماً یکساں نباشد حال دوراں غم مخور — دایم یک دھا توں نہ رہسے کا دمیزاں غم نکھا
ہاں مشو نومید چوں واقف نۂ از سر غیب — ہاں تو ناامید نا ہو کو نجانے سر غیب

باشد اندر پردہ بازیہائے پنہاں غم مخور — کیا اچھے گا پردے او جھل کھیل پتلیاں غم نکھا
اے دل ار سیل فنا بنیاد ہستی بر کند — اے ہیا موجاں تھے ناڈر من کا بھتا ہوئیگا
چوں ترا نوح ست کشتیباں ز طوفاں غم مخور — تو تجھے ہے نوح کشتیباں طوفاں غم نکھا
در بیاباں گر بشوق کعبہ خواہی زد قدم — او جنگل میں شوق سوں اب کعبہ خاطر رکھ قدم
سرزنشہا گر کند خار مغیلاں غم مخور — تج اگر بولیں جبیں کانٹے مغیلاں غم نکھا
گرچہ منزل بس خطرناکست و مقصد بس بعید — باٹ تیرا دور اگر ہے عشق پنتھ دکھلائے گا
ہیچ راہے نیست کانرا نیست پایاں غم مخور — شاہ راہاں توں ہے راہاں میں زراہاں غم نکھا
حال ما در فرقت جاناں و ابرام رقیب — حال میرا دوری ناداں ہور کوپ رقیب
جملہ میداند خدائے حال گرداں غم مخور — سب تو بوجھیا ہے خدا ہور شاہ مرداں غم نکھا
حافظا در کنج فقر و خلوت شبہائے تار — قطبشہ اس کنج فقر و خلوت دینی منے
تا بود وردت دعا و درس قرآن غم مخور[۲۴] — تا اچھے وردت دعا و درس قرآں غم نکھا[۲۵]

بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم — منگیا جو توبہ کے تیں صبح استخارہ کروں
بہار توبہ شکن میرسد چہ چارہ کنم — ہنگام توبہ توڑن آیا کیا میں چارہ کروں
سخن درست بگویم نمی توانم دید — درست بات کتا ہوں نجاسے منجہ تے دیکھیا
کہ مے خورند حریفان و من نظارہ کنم — شراب پیویں حریفان و میں نظارہ کروں
ز روے دوست مرا چوں گل مراد شگفت — سجن کے مکھ تھے کھلے ہیں امید پھول مرے
حوالہ سر دشمن بسنگ خارہ کنم — دندے کے سر کوں پھتر پہ پچھاڑ پارہ کروں
گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں — شرابخانے کا مسکیں ہوں دیکھ مستی میں

کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم   کرلاڈ انبر پہ کروں حکم تل سو تارہ کروں

مرا کہ نیست رہ و رسم لقمہ پرہیزی   جو منج میں نیں ابیں پرہیزگاری کے کاں

چرا ملامت رند شراب خوارہ کنم   شراب خور کو امانت سوں کیوں اشارہ کروں

بتخت گل بنشانم بتے چو سلطانے   پھولاں کے تخت بہ سلا ؤ میرے سلطاں کوں

ز سنبل و سمنش ساز طوق و یارہ کنم[26]   سنبل سمن کوں گلے بانس کر سنگارہ کروں[27]

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم   سکی آ پھول اچھالیں ہور سٹیں مد نیہہ ساغر میں

فلک را سقف بشگافیم و طرحے نو در اندازیم   سورج کی کھول کر کھڑکی سٹیں نو طرح انبر میں

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد   اگر لشکر لیا آوے غم جھگڑنے عاشقاں کے سم

من و ساقی بہم تازیم و بنیادش بر اندازیم   ہمیں ہور ساقی ہوں ہمدم سٹیں گے شور اس گھر میں

شراب ارغوانی را گلاب اندر قدح ریزیم   سٹیں گے لال مد سیانے پرت کے خوے کا گلاب

نسیم عطر گرداں را شکر در مجمر اندازیم   یوں خوش باش ہووے تیوں سٹیں سکر کوں مجمر میں

چو در دست است رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش   جو ہے تج ہات میں تانتاں بجا مطرب خوشی تاناں

کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم   خوشیاں سیتی لویں لاگاں انند ہور عیش ہے سر میں

صبا خاک وجود ما بداں عالیجناب انداز   صبا توں باٹ دکھلا ٹک ہمارے یار کے گھر کی

بود کاں شاہ خوباں را نظر بر منظر اندازیم   کہ شاید آوے دولا لن یکایک میرے منظر میں

یکے از عقل می لافد یکے طامات می بافد   کتک کرتے بڑی باتاں کتک کرتے خرافاتاں

بیا کاں داوری ہا را بہ پیش داور اندازیم   چل آ واں داد لے جاویں کہ ہے سب حکم داور میں

بہشت عدن اگر خواہی بیا با ما بمیخانہ   اگر جنت توں منگتا ہے تو آ میخانے میں منج سوں

کہ از پائے خمت روزے بحوض کوثر اندازیم[28]   کہ خم نزدیک تھے ملیں لڑیاں خوش حوض کوثر میں[29]

حواشی

[1] کسی نے سلطان تیمور کے سالہائے ولادت، جلوس و وفات کو درج ذیل رباعی میں یوں نظم کیا ہے:

سلطان تیمور کہ مثل او شاہ نبود   در ہفتصد و سی و شش آمد بوجود

در ہفتصد و ہفتاد و یکے کرد جلوس   در ہشتصد و ہفت کرد عالم پدرود

[2] دیوان حافظ شیرازی، باہتمام محمد قزوینی و دکتر قاسم غنی: ص ۳۰ [3] ایضاً ص ۱۵۳ [4] ایضاً ص ۱۰۳ [5] مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حیدرآباد (دکن) ۱۳۵۹ھ = ۱۹۴۰ء [6] کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، دوسرا حصہ: ص ۲۳۷، [7] ایضاً ص ۲۳۸ [8] ایضاً ص ۱۳۵ [9] دیوان حافظ، مرتبہ قزوینی: ص ۱۳۶ [10] ایضاً ص ۱۳۶ [11] کلیات محمد قلی قطب شاہ، دوسرا حصہ: ص ۳۳ [12] ایضاً ص ۱۳۱ [13] ایضاً ص ۱۳۱- [14] ایضاً ص ۱۲۳ [15] ایضاً ص ۱۱۶ [16] دیوان حافظ (قزوینی): صص ۲۹، ۴، ۴، ۵ [17] کلیات محمد قلی قطب شاہ: صص ۱۲۴، ۱۱۵، ۱۱۵، ۲۰۲ [18] بحر المعانی: ڈاکٹر جاوید وشِشٹ ص ۲۲ [19] کلیات محمد قلی قطب شاہ (دوسرا حصہ) ص ۱۰۸ [20] دیوان حافظ، مرتبہ قزوینی ص ۱۱۱ [21] کلیات محمد قلی قطب شاہ (دوسرا حصہ) صص ۲۸۸ - ۲۸۹ - اس غزل کے چار ابتدائی شعر ص ۲۵۶ پر بھی موجود ہیں اور ان کے نیچے تحریر کیا گیا ہے: "اس کے بعد صفحات غائب ہیں"۔ [22] دیوان حافظ: ص ۸۰ [23] کلیات محمد قلی قطب شاہ: ص ۱۲- حافظ کی غزل کا یہ ترجمہ کلیات محمد قلی قطب شاہ کے دوسرے حصے میں صفحہ نمبر ۲۸۵ و ۲۸۶ پر بھی موجود ہے۔ لیکن غیر مردف ہے اور ردیف "ے" میں شامل ہے۔ دونوں ترجموں کے مصرعہائے اول میں کوئی تبدیلی نہیں لیکن مصرعہائے ثانی سبھی شعروں کے بدلے ہوئے ہیں۔ نا بجا نا نہ ہوگا

اگر یہ ترجمہ یہاں نقل کیا جائے:

جے کوکہ ہتا میں جام لی ئیے	سلطانی جم مدام کی ئیے
پانی کہ خضر حیات پایا	مد گھر تھے تنک سو جام پی ئیے
سر دھاکہ جی مو کام دا کھو	اے دھاکہ کر اسوں نظام دی ئیے
میں ورد د عاقلاں و تسبی	مو یاد نین کوں سوں سی ئیے
باہر تو اُدھر تے ساقیا نا	اس دور منے کو کام جھی ئیے
تو جن ہتے شیوہ ہائے مستی	او دِ شٹ پنچل تھے دام لی ئیے
ذکر مکھ و زلف تج ہمن دل	یو حسن تھے صبح و شام جی ئیے
مو سینہ داغ درد دوکھوں	تج مکھ نمکی تمام دی ئیے

او چاہ تھڈی معانی کی جاں

تو حسن دو سو غلام کی ئیے

[۲۴] دیوان حافظ: صص ۱۷۲-۱۷۳ [۲۵] کلیات محمد قلی قطب شاہ: صص ۹-۱۰ [۲۶] دیوان حافظ: ۲۳۰ [۲۷] کلیات محمد قلی قطب شاہ: ص ۱۷۵ [۲۸] دیوان حافظ ص ۲۵۸ [۲۹] کلیات محمد قلی قطب شاہ: ص ۱۷۷۔

مفتی ولی اللہ فرخ آبادی

از جناب انور شاہ صاحب ٭

مفتی ولی اللہ فرخ آبادی کا نسبی تعلق ترمذ کے سادات سے تھا۔ ان کے اجداد میں سید احمد ترمذ سے لاہور تشریف لائے[۱] تاریخ فرخ آباد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بزرگ پہلے لاہور میں آباد ہوئے پھر قنوج اور سانڈی و داعی پور میں سکونت اختیار کی[۲]

مفتی ولی اللہ کے والد سید احمد علی سانڈی میں رہتے تھے، صوفیاء و مشائخ سے ان کے روابط تھے۔ انہوں نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے مفتی ولی اللہ پیدا ہوئے۔ دوسری بیوی فرخ آباد کے بزرگ سید فضل امام کی پوتی تھیں ان سے تین بیٹے سید وجیہ اللہ، لطف اللہ اور اشرف علی پیدا ہوئے[۳] ان کا انتقال ۸ شعبان ۱۱۸۷ھ کو ۵۱ سال کی عمر میں فرخ آباد میں ہوا اور سید فضل امام کی قبر کے قریب مدفون ہوئے۔ مفتی ولی اللہ نے تاریخ وفات کہی[۴]

سیادت مرتبت احمد علی رفت	بجنت بست با عز و مکرم
پئے تاریخ چون رفتم بفکرت	خرد گفتا ز شعبان بود ہشتم

ولادت اور تعلیم مفتی ولی اللہ کی ولادت ۱۴ شوال ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء کو بروز جمعہ اپنے آبائی وطن "سانڈی" میں ہوئی، تاریخ ولادت "جزاک اللہ فی الکونین خیرا" سے

٭ اسسٹنٹ لائبریرین شعبہ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

برآمد ہوتی ہے۔

۹ سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ فرخ آباد میں سکونت اختیار کی اور فرخ آباد، قنوج اور بریلی کے علماء سے تحصیل علم کی[۶]۔ متوسطات کی تکمیل مولوی فضل بہاری (متوفی ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء) سے کی، موجز اور شرح اسباب مولوی دائم علی کردی[۷] (متوفی ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء) سے پڑھیں اور علوم کی تکمیل مولانا عبدالباسط قنوجی (۱۲۲۳ھ) سے کی، حکیم رحم علی خاں (۱۲۲۶ھ) سے طریقہ طب کی تعلیم حاصل کی[۸]۔

حرمین کا سفر والد کے انتقال کے بعد ۱۱۸۹ھ میں مفتی ولی اللہ نے حرمین شریفین کے لئے رخت سفر باندھا، اثنائے سفر رحمت آباد جو دکن کا ایک شہر ہے قیام کیا اور وہاں خواجہ رحمت اللہ نقش بندی (۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) سے نقش بندیہ اور قادریہ سلسلہ میں بیعت ہوئے۔ ۱۱۹۰ھ میں حرمین پہنچے اور حج وزیارت سے مشرف ہوکر تحصیل علم میں لگ گئے۔ انہوں نے شیخ احمد سقر، ان کے والد شیخ محمد سعید سقر اور شیخ عبدالملک مفتی مکہ مکرمہ اور شیخ ابراہیم (مفتی شافعی) سے کتب حدیث پڑھیں اور ۱۱۹۱ھ میں وطن مراجعت کی اور درس وتدریس میں مشغول ہوگئے[۹]۔

۱۸۰۱ء میں فرخ آباد کی ریاست براہ راست انگریزوں کے زیر نگیں آگئی تو یہاں انگریزی نظم ونسق شروع ہوا۔ ۲۹ اگست ۱۸۰۵ء کو مولانا ولی اللہ فرخ آباد کے مفتیِ عدالت مقرر ہوئے اور ۱۳ اکتوبر ۱۸۲۸ء تک مفتی رہے[۱۰]۔

مدرسہ کا قیام ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں مفتی ولی اللہ نے اپنی ذاتی آمدنی سے چند مکانات خرید کر ایک مدرسہ تعمیر کیا جس کا تاریخی نام "فخر المراتب وربیع المفاخر" تھا۔ اس مدرسہ کا تذکرہ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی نے تاریخ قنوج میں کیا ہے۔ ۱۲۷۸ھ تک

اس میں تعلیم وتدریس کا سلسلہ جاری تھا[۱۲]۔ نواب حسن علی خاں نے بھی اس مدرسہ کا تذکرہ کیا ہے[۱۳]۔ لیکن ولیم اروِن جس وقت فرخ آباد پہنچے اس وقت وہاں تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوچکا تھا[۱۴]۔ مولانا عبدالحئی نے لکھا ہے کہ مدرسہ سے خلق کثیر نے استفادہ کیا[۱۵]۔ اس مدرسہ کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا تھا، ولیم اروِن نے اس سے استفادہ کیا تھا[۱۶]۔

حضرت شاہ اسمٰعیل شہید سے مناظرہ نواب صدیق حسن خاں نے شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی سے مفتی ولی اللہ کا ذکر اس طرح کیا ہے:

جب حضرت شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی رائے بریلی جاتے ہوئے فرخ آباد سے گزرے اور فرخ آباد کی لال سرائے میں مقیم ہوئے تو مفتی ولی اللہ فرخ آبادی ان سے ملاقات ومناظرہ کے لئے گئے اور دریافت کیا کہ آپ کے ہمراہ کوئی کتاب نہیں ہے؛ شاہ اسمٰعیل نے جواب دیا کہ ہاں ہمارے پاس کتاب اللہ ہے اور وہ ہمارے سینہ میں محفوظ ہے۔ اس پر مفتی صاحب نے کہا کہ عوام وخواص میں احکام الٰہی کی تبلیغ کے لئے کتب خانہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس پر شاہ اسمٰعیل نے جواب دیا کہ ہم احکام الٰہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقے پر پہنچاتے ہیں اور اگر کوئی نہیں مانتا ہے تو تلوار سے بتلاتے ہیں۔ مفتی صاحب یہ سُن کر خاموش ہوگئے۔ پھر خلاصۃ الحساب کے چند سوالات پر شاہ اسمٰعیل سے گفتگو ہوئی شاہ صاحب نے ان کو حل کردیا[۱۷]۔

وفات مفتی ولی اللہ کا انتقال ۵ رجمادی الثانی ۱۲۴۹ھ/ ۱۸ رنومبر ۱۸۳۳ء کو ہوا اور فرخ آباد میں مدفون ہوئے[۱۸]۔ درج ذیل مصرعہ سے ان کی تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔

ع دفن کردند گنج علم بخاک

بہادر علی سید نے اس مصرعہ سے تاریخ وفات مستخرج کی ہے[۱۹] ع گنج معانی برفت زیر زمیں۔

فضل وکمال کا اعتراف | مفتی ولی اللہ فرخ آبادی اپنے عہد کے نامور فاضل تھے۔ ان کے معاصرین اور بعد کے تذکرہ نگاروں نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں:

"مفتی ولی اللہ کو علوم صرف ونحو، فقہ وتفسیر اور حدیث میں کامل دست گاہ حاصل تھی"[۲۱]

مولانا عبدالحئی لکھنوی نے ان کو علمائے مشہورین میں شمار کیا ہے اور ان کی کتاب "تاریخ فرخ آباد" سے نزہۃ الخواطر کی تصنیف میں خاطر خواہ استفادہ بھی کیا ہے۔

مولوی رحمان علی لکھتے ہیں:

"مولوی ولی اللہ فرخ آبادی عالم باعمل اور فاضل اجل تھے۔ تفسیر میں نظم الجواہر تصنیف فرمائی جو درحقیقت جواہر کی لڑی ہے"[۲۲]

مولوی فقیر محمد نے لکھا ہے:

"مولوی محمد ولی اللہ فرخ آبادی فقیہ، محدث، مفسر، جامع علوم عقلیہ ونقلیہ تھے"[۲۳]

افسوس ہے کہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی کے بارے میں چند تذکروں کے سوا تلاش و جستجو کے باوجود کہیں معلومات نہیں ملتیں۔ ان کی کتاب تاریخ فرخ آباد کی اہمیت اس سے بھی واضح ہے کہ یہ کتاب ولیم اِرون کے مقالہ نوابان فرخ آباد کا اہم مرجع ہے[۲۴] اور مولانا عبدالحئی لکھنوی نے بھی نزہۃ الخواطر میں متعدد شخصیات کے حالات اس کتاب کے حوالے سے لکھے ہیں۔

معاصرین سے تعلقات | مولوی ولی اللہ فرخ آبادی کے اپنے معاصرین سے قریبی روابط تھے جن میں ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ امرا میں نواب یحییٰ خاں، نواب عبدالباقی

خاں اور ان کے بیٹے مرزا مغل، مشائخ میں شاہ ہدایت بنگالی، شاہ غلام عمادالدین بلگرامی، حاجی خدا یار خاں، رسول شاہ (مجذوب فرخ آبادی) اور علما میں مولوی ولی اللہ فرنگی محلی، مولوی علیم اللہ شاہ جہاں پوری، مولوی اکرام شاہ جہاں پوری، مولوی محمد ابراہیم بنارسی، مولوی روشن علی جونپوری وغیرہ اہم نام ہیں۔[۲۵]

شعری ذوق | گو مفتی ولی اللہ فرخ آبادی صاحب دیوان شاعر نہیں تھے تاہم ان کو شعر گوئی کا ملکہ حاصل تھا۔ ان کے چند اشعار متفرق مقامات پر ملتے ہیں لیکن وہ سب تاریخ گوئی کے قبیل کی چیزیں ہیں، ان کے والد کی وفات پر کہا ہوا قطعہ تاریخ گزر چکا ہے۔ ایک قطعۂ تاریخ فرخ آباد کے ایک رئیس امین الدولہ کی تعمیر کردہ مسجد کے لئے کہا ؂

امین الدولہ نواب بہرجنگ — بنا فرمود مسجد بہر عباد
پئے اتمام آن ہاتف بتاریخ — "عبادت خانہ حق" کرد ارشاد
۱۲۴۱

نواب امین الدولہ کا قطعہ تاریخ وفات بھی کہا ؂

نواب امین دولت و دین — در زمرۂ سروراں سر آمد
چوں کرد وفات بہر تاریخ — "پیوستہ برحمت حق" آمد

اگرچہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی کی نظم وغزل دستیاب نہیں ہے تاہم اشعار کا انتخاب کلام جو انہوں نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔ ان کے اعلیٰ شعری مذاق اور ذوق سخن فہمی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

تصنیف وتالیف | مفتی ولی اللہ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ جن کتابوں کے نام دریافت ہو سکے ہیں ان کا ذکر مختصر تعارف کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ نظم الجواہر ونضد الفرائد: نظم الجواہر تفسیر کی کتاب ہے۔ یہ اپنی

نوعیت کی منفرد اور عجیب و غریب کتاب ہے۔ متداول تفاسیر کے برخلاف اس کی ترتیب اور اس کے مضامین مدون کرنے کا اسلوب نرالا ہے۔ اسے تفسیر کے مقابلے میں قرآنیات کی کتاب کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس تفسیر میں تجوید و قرأت، صرف و نحو، لغت و اشتقاق منطق و فلسفہ، ہیئت و اقلیدس، معانی و بیان، فصاحت و بلاغت، تاریخ و واقعات طب و ادویہ، عقائد و مناظرہ، تصوف و سلوک، فقہ و اصول فقہ، حدیث و اصول حدیث تفسیر و اصول تفسیر وغیرہ کے علاوہ متعدد علوم زیر بحث آئے ہیں۔

تفسیر کا اسلوب یہ ہے کہ کہیں تمام مفردات قرآنیہ کی تشریح ہے کہیں مبہمات قرآنی کی تفسیر ہے، کہیں آیات احکام کی تفسیر ہے، کہیں تفسیر ماثور ہے۔ غرض یہ قرآن پر ایک جامع دائرۃ المعارف ہے[۲۶]

مفتی ولی اللہ کو خود بھی اس تفسیر پہ ناز تھا۔ ایک جگہ لکھا ہے "تفسیر نظم الجواہر دیدنی است و بریدہ و دل سپردنی"[۲۷] لیکن بوجوہ بعد میں اس کی شہرت باقی نہ رہ سکی اور اس کا نام یاد ایام سے محو ہوگیا۔ پروفیسر مختار الدین احمد نے اس کتاب کے وجود سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے[۲۸] لیکن اس کا ایک نسخہ مشتاق احمد تجاروی نے دریافت کیا[۲۹]۔ اس کے بعد راقم السطور کو اس کے اور مخطوطات کا علم ہوا۔ فی الوقت اس کے حسب ذیل مخطوطات کا راقم کو علم ہے۔

۱۔ مولانا آزاد لائبریری، ذخیرہ حبیب گنج۔ جلد اول، مکتوبہ ۱۲۳۶ھ، بخط مصنف ورق ۲۸۶

جلد سوم "

۲۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ — نصف اول در ۱۳ اجزاء

۳۔ جامعہ ہمدرد دہلی — جلد اول صفحات ۶۳۸، سنہ کتابت ۱۲۴۰ مع نظر ثانی

جلد دوم صفحات ۸۳۲ در سنہ ۱۲۴۲

جلد سوم صفحات ۶۶۰

۴۔ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ، جلد اول (ناقص)

جلد دوم

۵۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ — مجموعی صفحات ۱۴۱۴

۲۔ **تاریخ فرخ آباد** :۔ تاریخ فرخ آباد مفتی ولی اللہ کی اہم تصنیف ہے۔ یہ کتاب فرخ آباد کی سیاسی اور علمی تاریخ کا مستند ماخذ ہے۔ متعدد اہم نگارشات میں اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے متعدد مخطوطات برصغیر ہند و پاک میں اور یورپ کے کتب خانوں میں ملتے ہیں جن میں سے حسب ذیل کی راقم السطور کو اطلاع ہے۔

۱۔ نسخہ علی گڑھ مکتوبہ ۱۲۸۹۔ ۲۔ علی گڑھ، ذخیرہ عبدالسلام ۱۲۵۷

۳۔ علی گڑھ سبحان اللہ کلکشن ۱۲۸۴۔ ۴۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۲۷۷

۵۔ برٹش میوزیم ۱۸۵۲ — ۶۔ رضا لائبریری رام پور

۷۔ نسخہ مملوکہ ڈاکٹر اسلم فرخی ۱۲۹۱ — ۸۔ نسخہ مملوکہ عبدالحافظ خاں فرخ آبادی

۹۔ نسخہ دارالعلوم ندوۃ العلماء

۳۔ **تقویم** :۔ ایک تقویم ہے جس میں اہم واقعات عالم کی تاریخ کا تذکرہ ہے، اس کے صرف دو مخطوطے دریافت ہوئے ہیں۔ دونوں علی گڑھ کے ذخیرہ حبیب گنج میں ہیں۔ تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔ اوراق ۳۲۹۔ دوسرے نسخہ کے صرف ۹۵ اوراق ہیں، فہرست نگار نے غلطی سے ان دو نسخوں کو دو کتاب سمجھ لیا ہے۔

۴۔ **تاریخہائے وفات مختلف بزرگان** :۔ اس کتاب کا صرف ایک مخطوطہ

راقم کے علم میں ہے۔

۵۔ شرح وردالتقرب وحزب التوسل :۔ اس کتاب کا ایک مخطوطہ علی گڑھ میں موجود ہے اوراق ۴۴، سنہ کتابت درج نہیں۔ اس میں ایک فارسی رباعی ہے جو غالباً خود مفتی ولی اللہ کی نظم کردہ ہے ؎

اے ورد نام درود جناب تو   ورد زبان ماست مہ و سال، صبح و شام

از مہر تو چہ تحفہ فرستیم ماز دور   نزدیک ما ہمیں صلوات است والسلام

ایوب قادری نے غلطی سے شرح وردالتقرب کو ایک کتاب اور حزب التوسل کو دوسری کتاب سمجھ لیا۔ ان کو اس کے مخطوطات بھی دریافت نہ ہو سکے تھے[۳۰]۔

۶۔ نقود الصرف : اس کا ایک مخطوطہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانے میں اور ایک علی گڑھ میں موجود ہے، ایوب قادری نے اس کو بھی مفتی ولی اللہ کی مفقود کتابوں میں شمار کرایا ہے۔

۷۔ المطر الثجاج شرح صحیح مسلم ابن حجاج : حدیث شریف کی شہرۂ آفاق کتاب مسلم شریف کی شرح ہے۔ اس کا تذکرہ نواب صدیق حسن خاں نے اتحاف النبلاء میں اور مولانا عبدالحئی نے نزہۃ الخواطر میں کیا ہے۔ تاہم ابھی تک اس کے کسی نسخہ کا علم نہیں ہو سکا۔ اتحاف النبلاء سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب مکمل نہیں ہو سکی تھی۔

مذکورہ بالا تصنیفات کے علاوہ ان کی کسی دیگر تصنیف کا ابھی تک راقم کو علم نہیں ہو سکا، ان کی تاریخ فرخ آباد ترجمہ ہو کر شائع ہو گئی ہے۔ دیگر کتب ہنوز اشاعت کی منتظر ہیں، ان میں نظم الجواہر و نضد الفرائد اپنی نوعیت کی منفرد اور غیر معمولی کتاب ہے۔ حق ہے کہ اس پر تحقیقی کام کیا جائے اور اعلیٰ تحقیقی معیار پر اس کی اشاعت کا نظم کیا جائے۔

حواشی

[۱] مفتی ولی اللہ فرخ آبادی : عہد بنگش کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ۔ مرتبہ محمد ایوب قادری، ص ۴۲۸ [۲] ایضاً ص ۴۳۰ [۳] ایضاً ص ۲۶۵ [۴] ایضاً ص ۴۳۱ [۵] ایضاً ص ۴۳۲ نزہۃ الخواطر جلد ۷، ص ۵۲۶ [۶] ایضاً ص ۱۸، تاریخ قنوج قلمی (حبیب گنج) ص ۲۶۳ [۷] ایضاً ص ۱۸ [۸] ایضاً [۹] مولانا عبدالحئی لکھنوی، نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۵۲۶۔ عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ ص ۴۳۳ [۱۰] عہد بنگش ص ۲۱، تذکرہ شعرائے فرخ آباد ص ۶ [۱۱] عہد بنگش ص ۲۲، نزہۃ الخواطر جلد ۷، ص ۵۲۔ تذکرہ شعرائے فرخ آباد، ص ۶ [۱۲] نواب صدیق حسن خاں بھوپالی : تاریخ قنوج، قلمی ذخیرہ حبیب گنج، علی گڑھ ص ۲۶۳، بحوالہ عہد بنگش ص ۲۳ [۱۳] نواب حسن علی خاں : مآثر صدیقی۔ نولکشور لکھنؤ ۱۹۲۴ء۔ جلد اول ص ۶۲ [۱۴] عہد بنگش ص ۲۴ [۱۵] نزہۃ الخواطر جلد ۷، ص ۵۲ [۱۶] عہد بنگش ص ۲۳۔ تذکرہ شعرائے فرخ آباد ص ۶ [۱۷] تاریخ قنوج قلمی ص ۲۶۳، بحوالہ عہد بنگش ص ۲۳ [۱۸] عہد بنگش ص ۲۴ [۱۹] مفتی ولی اللہ فرخ آبادی : تذکرہ شعرائے فرخ آباد مرتبہ مختار الدین احمد مشمولہ اردو ادب جولائی۔ ستمبر ۱۹۵۴ء، ص ۶ [۲۰] تاریخ قنوج قلمی ص ۲۶۳، بحوالہ عہد بنگش ص ۱۹ [۲۱] نزہۃ الخواطر ص ۷/۵۲ [۲۲] رحمان علی : تذکرہ علمائے ہند (اردو) محمد ایوب قادری ص ۵۴۶ [۲۳] فقیر محمد جہلمی : حدائق الحنفیہ ص ۴۷۱ [۲۴] تذکرہ شعرائے فرخ آباد ص ۶ [۲۵] عہد بنگش ص ۲۱ [۲۶] نواب حسن علی خاں نے لکھا ہے کہ اس تفسیر پر مولوی اوحدالدین احمد بلگرامی اور مرزا حسن علی محدث وغیرہ نے کفر کا فتویٰ صادر کیا تھا (مآثر صدیقی ص ۱/۶۳) ممکن ہے کہ یہ فتویٰ اس لئے دیا ہو کہ اس تفسیر میں قرآن مجید کی تفسیر ترتیب قرآن کے موافق نہیں ہے بلکہ اپنی ترتیب خود قائم کر کے تفسیر کی ہے [۲۷] عہد بنگش ص ۴۳۲ [۲۸] تذکرہ شعرائے فرخ آباد

ص ۷، ۱۹؎ مشتاق احمد تجاروی: فہرست مخطوطات، ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی مشمولہ مجلہ تحقیقات اسلامی ۱۹۹۱ء عہد بنگش ص ۴۲

مراجع

۱۔ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی: عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ۔ مرتبہ ایوب قادری طبع کراچی ۱۹۶۵ء۔

۲۔ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی: تذکرہ شعرائے فرخ آباد۔ مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد، مشمولہ اردو ادب، جولائی ۱۹۵۴ء۔

۳۔ مولانا عبدالحئی لکھنوی: نزہۃ الخواطر، طبع حیدرآباد، ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۹ء

۴۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی: اتحاف النبلاء، مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ۔

۵۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی: تاریخ قنوج (قلمی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

۶۔ رحمان علی: تذکرہ علمائے ہند، اردو ترجمہ ایوب قادری، کراچی ۱۹۶۰ء

۷۔ فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیہ، نولکشور، لکھنؤ ۱۹۰۶ء

۸۔ نواب حسن علی خاں: مآثر صدیقی، نولکشور لکھنؤ ۱۹۲۴ء

۹۔ نسخہ ہائے خطی فارسی ندوۃ العلماء لکھنؤ، خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران۔

۱۰۔ محمد مشتاق تجاروی: فہرست مخطوطات ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ۔ مشمولہ مجلہ تحقیقات اسلامی ۱۹۹۱ء

۱۱- M.H. RIZVI: CATLOGUE OF MANUSCRIPT, IN THE MAULANA AZAD LIBRARY, A.M.U. 1985.

تلمیحات کا مفہوم

از مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی*

دسمبر ۲۰۰۰ء کے معارف کے شمارہ میں ایک مضمون "اقبال کے کلام میں قرآنی تلمیحات" چھپا تھا، عنوان کی دل آویزی اور ندرت سے انکار نہیں اور غالباً اسی عنوان سے متاثر ہو کر اور معارف پر اعتماد کر کے "تعمیر حیات" کے ادارہ نے اس مضمون کو نقل کر دیا ہے[1] اس مضمون میں تلمیحات کے معنی جو لکھے گئے ہیں وہ عربی و اردو میں اس کے استعمالات سے یکسر ناواقفیت کی دلیل ہے، مقالہ نگار فرماتے ہیں:

> تلمیحات کے معنی یہ ہیں کہ کم از کم الفاظ سے بلاغت پیدا کی جائے اور طویل مضمون اور کتابوں اور علمی مسئلوں اور اصولوں کے بیان کرنے میں جو وقت ضایع کرنا پڑتا ہے اس سے تلمیحوں اور اصطلاحوں کے ذریعہ بچا جائے، جس زبان میں تلمیحات کم ہیں یا بالکل ہی نہیں ہیں وہ بلاغت سے گری ہوئی خیال کی جاتی ہے۔" (معارف دسمبر ۲۰۰۰ء ص ۴۴۷)

اور اس کی مثال میں اقبال کے وہ اشعار دئے ہیں جن میں بعض آیات کریمہ کے الفاظ یا عربی جملے یا کوئی عربی مصرعہ آیا ہے جیسے ؎

علم کا موجد اور فقر کا موجد اور — اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

اسی طرح "ورفعنا لک ذکرک، سبحان ربی الاعلیٰ، قل ھو اللہ احد، ھو اللہ

---

[1] اس استدراک کے لئے معارف مقالہ نگار کا ممنون ہے۔

* پوسٹ باکس نمبر ۱۸۸۴، مکہ مکرمہ سعودی عربیہ۔

احد، قم باذن اللہ، لا الٰہ الا اللہ، لا الٰہ الا ھو۔

آیات کے علاوہ اقبال نے بعض جگہ عربی جملے کو نظم کر دئے ہیں جیسے لا غالب الا ھو، اور حدیث کا جملہ "الفقر فخری" یا قرآن کو "ام الکتاب" وغیرہ، مقالہ نگار نے اس طرح کی تضمینات کو جو صریح معانی پر مشتمل ہیں تلمیحات سمجھا ہے،

"تلمیحات" جمع ہے "تلمیح" کی اور لغت کی تمام کتابوں میں "لمّح" کے معنی ہیں اشارہ کرنا، فن بلاغت کی قسم بدیع میں اس کا مفہوم "مختصر المعانی" میں یہ مذکور ہے ملاحظہ فرمائیے:

"اما التلمیح: صح بتقدیم اللام علی المیم من لمحہ، اذا البصرہ و نظر الیہ، وکثیر اما نسمعہ یقولون: "لمّح فلان" ھذا البیت فقال کذا و فی ھذا البیت تلمیح الی قول فلان"۔

یعنی لفظ "تلمیح" جس میں میم سے پہلے لام ہے اس کا مفہوم ہے نگاہ ڈالنا، یا دیکھ لینا اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے اس شعر کی تلمیح کی ہے، یعنی شعر کے کسی لفظ کی طرف ایسا اشارہ کیا ہے جس سے اس کا مفہوم واضح ہو۔

تلمیح کی ایک اچھی مثال "ابو تمام" کے اس قصیدہ کے پہلے شعر میں ہے جو معتصم باللہ کی مدح میں لکھا تھا۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ معتصم نے عموریہ (اس کی سلطنت کا ایک بڑا شہر) کو فتح کرنے کا ارادہ کیا تو اس وقت کے منجموں نے یہ پیشین گوئی کی کہ معتصم "عموریہ" کو فتح نہیں کر سکتا اور روم کے نجومیوں نے یہ لکھا کہ ہمارا شہر جس زمانہ میں فتح ہوگا وہ انگور اور انجیر کے پکنے کا زمانہ ہوگا، یہ وقت کئی مہینوں کے بعد آنے والا تھا، لیکن معتصم نے کسی نجومی کی بات نہیں سنی اور عموریہ کو فتح کر لیا۔ اس پر

ابو تمام نے جو قصیدہ لکھا اس کا پہلا شعر صحیح معنوں میں "تلمیح" ہے اور پورا قصیدہ عربی ادب کے طالب علموں کی دلچسپی کی چیز ہے، ابو تمام نے کہا ہے

السیف اصدق انباءً من الکتب   فی حدہ الحد بین الجد واللعب

یعنی تلوار خبر دینے میں (نجومیوں کی) کتابوں سے زیادہ سچی ہے کیونکہ اس کی دھار میں واقعیت اور لغو اور بے کار کام کے درمیان ایک حد قائم ہے اس شعر میں "الکتب" تلمیح ہے۔ جس سے نجومیوں کی "پوتھی" مراد ہے، دوسرا شعر بھی اسی مفہوم میں ہے جو شاعری، دانشوری، حکمت کا مجموعہ ہے۔

بیض الصفائح لاسود الصحائف فی   متونھن جلاء الشک والریب

ترجمہ: تیز تلوار کی چمک کام کی چیز ہے، نجومیوں کی پوتھیوں کی سیاہی بے سود ہے۔ تلواروں کی تیزی شک و شبہ کو دور کر دیتی ہے (ملاحظہ ہو صنعت تضاد، بیض الصفائح سود الصحائف)

اب شعر میں دیکھئے جو لوگ عموریہ کے فتح سے واقف تھے ان کے لئے ایک اشارہ ہے۔

اقبال کے کلام میں "قرآنی تلمیحات" تلاش کرنا ہو تو اس کی بہترین مثال "بانگ درا" میں "خضر راہ" کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے

کشتی مسکین و "جان پاک" و "دیوار یتیم"   علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

اس میں بے شک ایک "تلمیح" ہے سورۂ قصص[1] میں بیان کردہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

یا ان کا یہ شعر

---

[1] معارف: سورۂ قصص لغزش قلم ہے، صحیح سورۂ کہف ہے۔

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے　　کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اس شعر میں کھلا ہوا اشارہ ترکی میں انقلاب کا مذکور ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ "تلمیح" اشارہ کو کہتے ہیں جو کنایہ کی ایک قسم ہے اور ایسا اشارہ جس سے پوری داستان واقف کاروں کی سمجھ میں آجائے، نہ کہ عربی، فارسی یا کسی زبان کے پورے پورے جملے کو تضمین کے طور پر شعر میں داخل کر دیا جائے" اس کو تلمیح نہیں کہتے۔ جیسا کہ اوپر گذرا۔ اقبال نے کلام پاک کی آیات یا خود اپنی طرف سے ایک عربی جملہ نظم کر دیا یا حدیث کا کوئی ٹکڑا لے آئے اس کو تلمیحات کہنا لفظ "تلمیحات" سے عدم واقفیت کی دلیل ہے۔ فن عروض کی اصطلاح میں اس کو "تضمین" کہتے ہیں۔ یہ اردو والی تضمین نہیں ہے کہ مصرعہ پر مصرعہ لگایا جائے بلکہ کوئی قول یا اقوال کا جز شعر میں موزوں کر دیا جائے۔

تلخیص و تبصرہ

از کلیم صفات اصلاحی

غانا میں اسلام اور مسلمان

"زیر نظر تلخیص میں مقامات کے عربی ناموں کو انگریزی قالب "WORLD REFERE-NCE ATLAS" کی مدد سے دیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے، اس میں دنیا کے مختلف ملکوں کے جغرافی، سیاسی، تمدنی، تعلیمی اور مذہبی حالات تلاش و محنت سے قلم بند کئے گئے ہیں، انگریزی داں طبقہ میں اس کو کافی مقبولیت حاصل ہے، اسکا اندازہ اس کے متعدد ایڈیشنوں سے ہوتا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ڈارلنگ کنڈرس لی لمیٹڈ لندن نے ۱۹۹۴ء میں دوسرا ۱۹۹۵ء، تیسرا ۱۹۹۶ء اور چوتھا ۱۹۹۸ء میں شایع کیا تاہم اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں مسلمانوں کے صحیح حالات سے چشم پوشی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ نیز اسی کتاب سے تلخیص میں بعض معلومات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔" "مترجم"

غانا (GHANA) کی مسلم اقلیت مختلف المذاہب لوگوں کے درمیان زندگی گزار رہی ہے، جن میں ہندو، بدھسٹ، عیسائی قابل ذکر تعداد میں ہیں۔ کبھی یہاں فوجی حکومت کا بول بالا رہتا ہے تو کبھی جمہوری حکومتوں کا قبضہ و تصرف ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے غانا کی سیاسی و تمدنی حالت بھی مختلف رہی۔ تاہم اس کے باشندوں کے دینی تہذیبی اور معاشرتی حقوق محفوظ و مامون رہے۔

غانا براعظم افریقہ کے مغرب میں واقع ہے۔ ماضی میں یہ ملک ساحل الذہب (سونے کا

ساحل) کے نام سے معروف ومشہور تھا۔ ۱۸۹۶ء میں یہ ملک برطانوی اقتدار کے زیر نگیں آیا اور ۱۹۵۷ء میں اس نے پروانۂ خود مختاری حاصل کی۔ اس کے مشرق میں توجو (TOGO) مغرب میں ساحل العاج (IVORY COAST) شمال میں فولٹا العلیا (VOLTA) اور برکینا (BURKINA) اور جنوب میں بحر اٹلانٹک (ATLANTIC OCEAN) ہے۔

غانا کا کل رقبہ ۲۳۸۵۳۷ کیلو میٹر ہے[1]۔ یہاں کی کل آبادی ایک کروڑ پندرہ لاکھ ہے[2]۔ اس کا دار الحکومت اکرا (ACCRA) ہے جو جنوبی سواحل سے لگا ہوا ہے۔ اس کے اہم شہروں میں کوماسی (KUMASI) تیما (TEMA) تاکوردی (TAKORDI) وغیرہ ہیں۔ سرزمین غانا کا اکثر حصہ ہموار زمینوں پر مشتمل ہے۔ اس کے جنوب وشمال میں بھی متفرق طور پر ساحل کے کنارے ہموار زمینیں ہیں، غانا کے درمیانی علاقہ میں چھوٹے چھوٹے رتیلے اور پتھریلے ٹیلے ہیں۔ اس ملک کی سب سے اہم نہر فولٹا (VOLTA) ہے اور اسی سے نہر فولٹا ابیض (WHITE VOLTA) نہر فولٹا اسود (BLACK VOLTA) اور اوٹی وغیرہ ندیاں نکلی ہوئی ہیں۔

غانا خط استوار پر واقع ہے۔ یہاں کی آب وہوا (ATMOSPHERE) پر اسی کے اثرات ہیں۔ جنوب میں کثرت سے بارش ہوتی ہے اور یہی حال شمال کا بھی ہے۔

غانا کے باشندوں کا تعلق حبشی قبائل سے ہے۔ ان میں غانتی، اشانتی، موسی، اکان، ایوی، کوماسی اور مابردسی وغیرہ شامل ہیں جو ہوسا اور فولانی کی شاخیں ہیں۔ یہ لوگ قبول اسلام کے بعد شمال سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے، اس کے علاوہ پڑوسی ملکوں سے بھی

---

[1] ورلڈ ریفرنس اٹلس کے مطابق ۲۳۸۵۴۰ اسکوائر مربع میٹر یعنی ۹۲۱۰۰ اسکوائر میل ہے (ص ۲۴۲)

[2] ورلڈ ریفرنس اٹلس کے رو سے اس کی کل آبادی 17.5 میل یعنی ایک کروڑ ستر لاکھ سے زائد ہے۔

لوگ نقل مکانی کرکے یہاں سکونت پذیر ہوئے ہیں۔ جن کے توسط سے غانا میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔ انگریزی گو سرکاری زبان ہے تاہم بعض علاقائی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے مدرسوں میں عربی زبان پڑھائی جاتی ہے۔

معاش کا انحصار زراعت پر ہے۔ اسی لئے غانا کے باشندوں کی اکثریت زراعت پیشہ ہے کاکاؤ[1] کی کاشت اصل ذریعہ معاش ہے۔ سرزمین غانا کے نصف سے زیادہ حصے میں کاشتکاری ہی ہوتی ہے۔ بن[2] زیتون، اناس وغیرہ کی کھیتیاں خاص طور پر کی جاتی ہیں۔ غذائی اشیاء میں چاول، مکئی، کاسافا[3] اور یام[4] وغیرہ سے غانا کے باشندوں کو خاص دلچسپی ہے۔ غانا کی معاشی خوش حالی وفارغ البالی میں بڑے بڑے جنگلات کی لکڑیاں اور فرنیچر کا کاروبار بھی کافی اہم ہے۔ شمالی علاقوں کے لوگوں کو گلہ بانی اور مویشی پالنے کا بڑا شوق ہے۔ چنانچہ جانوروں کے چارہ کے لئے سافانا[5] کی گھاس اگائی جاتی ہے۔ معدنی کاروبار کو پورے ملک میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ سونا، تانبہ، نیکل[6] اور بوکیسٹ وغیرہ غانا کی خاص معدنیات ہیں۔ نہر فولٹا کے بندھ بن جانے کے بعد صنعت وحرفت میں اضافہ ہوا ہے اور المونیم، کپڑے اور کیمیائی مصنوعات تیار کی جانے لگی ہیں۔

غانا میں اسلام کا اثر ونفوذ گیارہویں صدی ہجری کے آخر میں اسلام کا نفوذ غانا کے حدود میں اس وقت ہوا جب قبیلہ ماندی کی ایک شاخ نائیجیریا سے ہجرت کرکے گھنے جنگلات

---

[1] یہ غانا کی خاص پیداوار ہے اس کی تحقیق نہیں ہو سکی [2] ایک قسم کا درخت جس کے چھوٹے دانوں کو پیس کر قہوہ (چائے کی طرح کا مشروب) میں استعمال کیا جاتا ہے [3] خط استوار پر واقع علاقوں کی نشیب زمینوں میں اُگنے والا پھل دار درخت جس کے پتے چوڑے اور پھول چھوٹے ہوتے ہیں، اسی سے معجون شوکولاتا تیار کیا جاتا ہے [4] اس لفظ کی تحقیق نہیں ہو سکی [5] ایک قسم کی گھاس جو جانوروں کے چارہ کے لئے اگائی جاتی ہے [6] ایک قسم کی دھات۔

اور دشوار گزار راہوں کو طے کرتی ہوئی اپنے مویشیوں کے ساتھ یہاں پہونچی اور شمال مشرق کا رُخ کیا جہاں حکومت جونجا (VOANJA) کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اس کے سیاسی اقتدار سے مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا۔ عجب نہیں کہ اس کے بانی بادشاہ جاکا بانے ماندی مسلمانوں کو اپنے علاقہ میں جگہ دی ہو، اسی لئے دوسری قوموں سے اس کی لڑائیوں میں مسلمانوں نے محمد الابیض کی قیادت میں اس کا ساتھ دیا۔ جاکابا کی وفات کے بعد گو اس کی حکومت اس کے دونوں لڑکوں میں منقسم ہوگئی۔ تاہم ہر ایک کے دربار میں محمد الابیض کے بیٹے باریاب رہے۔ اس طرح شمالی غانا میں مملکت جونجا کے قیام ہی سے اس کو مسلمانوں کا تعاون حاصل رہا اور اس کے سیاسی اور معاشی اقتدار سے مسلمانوں نے مدت دراز تک فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ اسلامی تہواروں کو حکومت جونجا میں سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا۔ نہر فولٹا الابیض (WHITE VOLTA) کے کنارے کے شہر جونجا حکومت کے آثار باقیہ میں ہے۔

غرض اس حکومت کے زمانے میں علم و تعلیم کے میدانوں میں مسلمان کافی آگے تھے، جس کا اندازہ جونجا کی اس تاریخی دستاویز سے ہوتا ہے جو بارہویں صدی ہجری کے نصف آخر میں عربی میں لکھی ہوئی غانا کی معہد الدراسات الافریقیہ میں محفوظ ہے۔

غانا میں اشاعت اسلام کے دوسرے دور کا آغاز اس وقت ہوا جب ماندی قبیلہ کے کچھ مسلمان وفد کی شکل میں شہر جونجا گئے جو داجومبا زبان سے واقف تھے اور انہوں نے نہر فولٹا الابیض (WHITE VOLTA) پر آباد داجومبا قبائل میں اسلام کی اشاعت کی۔

شمالی غانا میں اشاعت اسلام کے تیسرے دور کا آغاز بارہویں صدی ہجری کی ابتدا سے ہوتا ہے۔ جب ہوسا اور بورنو کے مسلم تاجر جب الکولا کے حصول کے لئے تجارتی راستوں کے ذریعہ غانا میں داخل ہوئے۔ اس دور کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ مذہب اسلام سے

داجومبا کے بیشتر قبائل نہ صرف آشنا ہوئے بلکہ ان کے ہر خاندان (شاخ) میں اسلام پہنچ گیا۔ ان قبائل کے رہنماؤں نے اپنے اپنے زیر اثر علاقوں میں دائرہ اسلام کو وسیع کرنے کی کوششیں کیں جس کے نتیجہ میں قبائل داجومبا کے اکثر افراد نے اسلام کو اپنا لیا اور فطری جاذبیت کی بنا پر وہ غانا کے دوسرے حبشی قبیلوں کے دلوں میں بھی گھر کرتا گیا۔ جب شمالی غانا میں اسلام عام ہوگیا تو شہر جمبا جا ایک اسلامی مرکز میں تبدیل ہوگیا۔ کئی دوسری اسلامی ریاستیں بھی وجود میں آئیں جو برطانوی تسلط سے قبل غانا ہی میں داخل تھیں۔

وسط غانا میں اسلام کی تبلیغ

غانا کے وسطی علاقوں میں تبلیغ اسلام کا سہرا مسلم تاجروں کے سر بندھتا ہے۔ بارہویں صدی ہجری کے نصف ثانی میں بورنو اور ہوسہ کے تاجروں کی تحریک سے وسط غانا کے شہر سلاجہ میں ایک اسلامی مدرسہ قائم ہوا۔

تیرہویں صدی ہجری کے آغاز میں اسلام کے قدم جنوب میں کوماسی (KUMASI) تک پہنچ گئے تھے۔ اسی زمانے میں برطانوی استعمار کی ریشہ دوانیاں شروع ہوئیں اور غانا کو برطانوی استعمار میں داخل کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔

غانا میں اس وقت تہائی سے زیادہ مسلمانوں کی آبادی ہے[1]۔ ان کی معتدبہ تعداد حبشی قبائل سے تعلق رکھتی ہے جن میں موسی اور جبانی خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔ داجومبا، موسی، جردشی، مامپروسی، وایا، اکان، توی، فاتی، ترما، یوربا، ہوسہ، جوما، کوتوکوی، سنفنی اور فولانی قبائل کے مسلمان بھی غانا میں مقیم ہیں۔ بربری اور عربی اقلیت میں ہیں۔ یہ سب لوگ زیادہ تر شمال اور وسط میں رہتے ہیں لیکن مسلمانوں کی اکثریت جنوبی غانا کے اہم شہروں میں اقامت پذیر ہے اور انہی لوگوں نے عیسائی مشنریوں کی اس فکری یلغار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جو

---

[1] ورلڈ ریفرنس اٹلس کے مطابق غانا میں مسلمانوں کی آبادی ۳۰٪ ہے۔

برطانوی استعمار و تسلط کے زمانے میں عروج پر تھی۔ اس زمانے میں حالات مسلمانوں کے لئے سخت اور پرآشوب تھے۔ تاہم انہوں نے مسجدیں بھی تعمیر کیں اور غانا میں اسلام کی نشر و اشاعت کا دائرہ بھی وسیع کیا۔

تعلیمی حالت غانا کے شمال اور وسط میں اسلامی مدرسے قائم اور مسجدوں سے ملحق درس گاہیں بھی ہیں۔ سعودیہ عربیہ اور دوسرے ملکوں کے مبعوثین بھی غانا میں علم و تعلیم کو فروغ دے رہے ہیں جو اسلام کی نشر و اشاعت اور عربی زبان کی ترویج پر بھی مامور ہو جاتے ہیں۔ ھیئۃ الدعوۃ والارشاد ریاض کے علماء و دعاۃ معہد النوریہ میں مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ درسگاہ تمبیل (TAAMBLE) کے علاقہ میں جہاں ۸۵٪ مسلمان ہیں۔ اس کے فارغین پورے ملک کے باشندوں تک اسلام کا پیغام مقامی زبانوں میں پہونچا رہے ہیں۔

غانا کے مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ عیسائی اور یہودی تنظیمیں ہیں جن کی ریشہ دوانیوں نے تمام دنیائے اسلام کو تہ و بالا کر رکھا ہے، قادیانیت اسلام ہی کے بھیس میں اس کی بیخ کنی میں لگی ہے۔ اس صورت حال کے مقابلہ کے لئے مخلص مسلمانوں کو انہیں تعاون دینے کے لئے آگے بڑھنا چاہئے۔

ماخوذ: التضامن الاسلامی، مکہ مکرمہ

(اکتوبر ۱۹۹۰ء)

عربوں کی جہاز رانی

مرتبہ: علامہ سید سلیمان ندویؒ

وفیات

آہ ڈاکٹر عبدالربّ عرفان!

قارئین معارف کو یہ سن کر بڑا افسوس ہوگا کہ ڈاکٹر عبدالرب عرفان ۳۰ اپریل کو انتقال کر گئے، وہ معارف کے بڑے قدرداں اور خاص مضمون نگار اور دار المصنفین شبلی اکیڈمی سے گہرا تعلق رکھتے تھے، اردو فارسی کے عالم اور ان زبانوں کی ادبیات کی تاریخ سے اچھی واقفیت رکھتے تھے، ہندوستان کے عہد اسلامی کی تاریخ پر ان کی نظر تھی، اس عہد کے سلاطین و مشائخ اور علماء و فضلاء کے حالات و تراجم سے ان کو بڑی دلچسپی تھی اور اس پر ان کے مضامین ملک کے بلند پایہ رسالوں میں شائع ہوتے تھے مگر معارف پر ان کی نظر عنایت زیادہ تھی۔ اس شمارے میں بھی ان کا ایک مضمون شامل ہے اور ابھی دو ایک اور مضامین میری فائل میں ہوں گے۔

میری ان کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی مگر خط و کتابت رہتی تھی، ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے دل میں میری کتنی قدر و محبت اور معارف سے ان کو کیسا والہانہ لگاؤ تھا۔ مجھے ان کے حالات زندگی سے کوئی واقفیت نہیں تھی ان کے ایک ہم وطن جناب فیروز حیدری کے خط سے معلوم ہوا کہ انہوں نے کامٹی کے ایم۔ ایم ربانی ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبر سے پاس کیا تھا اور مارس کالج ناگپور سے بی۔ اے کیا تھا۔ پھر فارسی زبان و ادب میں ایم۔ اے میں امتیازی نمبر ہی نہیں بلکہ گولڈ میڈل کے بھی حق دار قرار پائے تھے ۱۹۶۱ء میں ودربھ مہاودیالیہ امراؤتی میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا اور بہت جلد شعبہ فارسی کے صدر بنائے گئے، ۱۹۸۲ء میں ان کا تبادلہ ناگپور میں وسنت راؤ نائک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز (سابق مارس کالج) میں ہوگیا۔ ڈاکٹر عبدالرب عرفان طبعاً شریف، سادہ مزاج، صاف گو، مخلص اور کم آمیز تھے، ان میں کبر و غرور کا شائبہ نہ تھا۔ مرحوم کی عمر ۶۵ برس رہی ہوگی، قلب کی بیماری پہلے سے تھی وہی جان لیوا ثابت ہوئی، اللہ تعالیٰ بشری لغزشوں سے درگزر فرمائے اور اپنی رحمت کاملہ سے نوازے آمین!!

"ض"

ادبیات

نورِ نبوت

از جناب علی جواد زیدی صاحب٭

یہ مدتوں سوچتا رہا ہوں کہ ذکر چھیڑوں کہاں سے پہلے
کہ خلقت[1] نور ہو چکی تھی، وجود کون و مکاں سے پہلے

بڑی ہی نازک سی منزلیں ہیں کہ گزریں کیوں کر کہاں سے پہلے
ہے تھوڑی تمہید بھی ضروری حقیقتوں کے بیاں سے پہلے

سکوت کی وسعتیں فراواں کہیں نہ جن و ملک نہ انساں
نہ جوشِ بحر اور نہ حسنِ خوباں تشخصِ این و آں سے پہلے

وجود مطلق ہے علم مطلق، وہ جو بھی چاہے وہی ہے برحق
نظامِ کلمات ہو گیا شق شہود و وہم و گماں سے پہلے

فضائے تکوین جاگ اٹھی، سکوت کی گہری نیند ٹوٹی
سکوت تو تھا عدم نہیں تھا بشارتِ کن فکاں[2] سے پہلے

سکوت تھا جیسا معجزانہ فضا تھی ویسی ہی فاتحانہ
ندائے کن اولیں اذاں تھی، نماز[3] ہر دو جہاں سے پہلے

وہ کن کا فیضانِ کبریائی، وہ شانِ تخلیق و رہنمائی
وجود امکاں میں نور آیا، زمیں سے پہلے زماں سے پہلے

وجود شمس و قمر نہیں تھا فراقِ شام و سحر نہیں تھا
نمودِ برق و شرر کہاں تھی مکیں سے پہلے مکاں سے پہلے

عروجِ خاکی میں شانِ نوری یہی رسالت یہی نبوت
وجود کے راز تک پہنچنا، گزر کے ہر آسماں سے پہلے

یہ نورِ اول سے آؤ پوچھیں کہ چاند سورج کہاں سے چمکے
یہ جگمگاہٹ کہاں سے آئی کواکب و کہکشاں سے پہلے

---

[1] حدیث رسول مقبولؐ "اول ما خلق اللہ نوری" [2] کن (ہو جا) فکاں (بس ہو گیا) فرقانی اشارات۔

[3] اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ مختلف زبانوں میں دونوں عالموں میں نماز اور اعلانِ نماز کے مختلف طریقے رائج رہے ہوں گے۔

٭ ۵/۳۱۹ ورام کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ۔

یہ خلقِ اول یہ نورِ اول یہ نصِ اول ہے شبہ کیا ہے
کہاں نبیوں کے سلسلے تھے، خیال و وہم و گماں سے پہلے

یہ حکمت و فلسفہ نہیں ہے کہ فلسفے کا وجود کب تھا
یہ نور خود ایک فلسفہ ہے کتب سے پہلے زباں سے پہلے

ہوا یکایک سنک رہی ہے و لیکن یک چشمے جاگتے ہیں
جبال کی سرکشی سے پہلے، نمودِ آبِ رواں سے پہلے

سوالِ[1] ارنی پہ دورِ موسیٰ میں طور سوز انقلاب آیا
کسی کو معراج کب ملی تھی رسول عظمت نشاں سے پہلے

وہ عیسیٰ[2] و نوحؑ[3] کے زمانے جنابِ داؤد[4] کے ترانے
یہ آگ کب بن سکی گلشن خلیلؑ[5] کے امتحاں سے پہلے

یہ سلسلہ چل رہا تھا یوں ہی، جناب آدمؑ[6] سے تا بہ احمدؐ
ہے اک بڑا کاروانِ نوری نبیِ رحمت نشاں سے پہلے

جبھی تو امی لقب ہے اس کا رسول کی شان بھی یہی ہے
ازل ابد کے کنارے دونوں ملا دیے امتحاں سے پہلے

وہ بچیاں زندہ دفن کرنے کی رسم ہی اٹھ گئی[7] عرب سے
یہ بربریت نہ مٹنے پائی، رسول رحمت نشاں سے پہلے

حقوقِ نسواں کی بات کس نے کبھی سنی تھی؟ کہاں سنی تھی؟
یہ زمزمے کب سنے جہاں نے، رسول کے آستاں سے پہلے

خدا کی رحمت نے اس کو سرسبز اور شاداب کر دکھایا
عرب تھا اک ریگزار بریاں نبیِ آخر الزماں سے پہلے

وہ شاخیں چھانٹیں، چنے وہ کانٹے، قطاریں باندھیں روش بنائی
یہ باغبانی تو بعد کی ہے کہ باغ تھا باغباں سے پہلے

سفینۂ فکر بھی یہی ہے، مدینۂ[8] علم بھی یہی ہے
عروجِ عرفان و آگہی ہے یقیں نہاں پر عیاں سے پہلے

---

[1] حضرت موسیٰ کی تمنا "اے خدا میں تجھ کو دیکھنا چاہتا ہوں" اُدھر سے جواب آیا "لن ترانی" یعنی تم مجھ کو دیکھ نہیں سکتے۔ مزید اظہار پر ایک چمک ہوئی جس سے کوہ طور جل گیا اور حضرت موسیٰ بے ہوش ہو گئے۔ [2] ایک مشہور پیغمبر حضرت عیسیٰ مسیح [3] ایک مشہور پیغمبر جن کی کشتی طوفان میں سفینۂ نجات بنی [4] وہ مشہور پیغمبر جن کے روحانی نغمے مشہور ہیں [5] حضرت ابراہیم خلیل اللہ بھی عظیم پیغمبروں میں ہیں۔ آگ کے ذریعے آپ کا امتحان لیا گیا مگر آگ، گلزار میں تبدیل ہو گئی [6] سب سے پہلے نبیؑ [7] عرب میں یہ قبیح ظالمانہ رسم تھی کہ لڑکی پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دی جاتی تھی۔ رسول مقبولؐ کی تبلیغ سے یہ رسم ختم ہوئی [8] رسولؐ کی حدیث "انا مدینۃ العلم و علیٌ بابہا"

معارف: قصیدہ کی شروع کی حدیث کا روایتی پایہ کمزور ہے۔

یہی تھا مکہ یہی مدینہ، مگر یہ سب رونقیں کہاں تھیں ۔۔۔ محمد مصطفیٰ سے پہلے رسولؐ ہر دو جہاں سے پہلے

مہاجروں پہ مدینہ والوں نے پھول برسائے الفتوں کے ۔۔۔ فضا عقیدت کی بن چکی تھی رسولؐ کے کارواں سے پہلے

ہے قابل عفو میری جرأت، کہ دھن سمائی مجھے یکایک ۔۔۔ پیوں نہ کیوں ایک جرعہ میں بھی مناقب بیکراں سے پہلے

یہ شیوہ نعت محمدیؐ کا نہیں ہے گو مستند عزیزو ۔۔۔ مگر مجھے خود روی مبارک کہ وجد آیا بیاں سے پہلے

قصور زیدیؔ معاف کیجئے کہ وہ ہے دیوانہ محمدؐ

کمال فن و ہنر کہاں تھا عقیدت جاوداں سے پہلے

یہ سب مطالب کسے سناؤں کسے یہ شانِ سخن دکھاؤں

جو قدرداں تھے ہمارے زیدیؔ وہ اٹھ چکے ہیں جہاں سے پہلے

ہوں در گہہ مصطفیٰ میں حاضر ابھی تو اے موت کے فرشتے

ترے ہی ہمراہ چل پڑوں گا ملی جو رخصت وہاں سے پہلے

نعت

از اقبال عظیم (کراچی، پاکستان)

مجھ کو بھی کاش جلوہ خضرا دکھائی دے ۔۔۔ بے نور آنکھ سے بھی اجالا دکھائی دے

یارب عطا ہو مجھ کو وہ مخصوص روشنی ۔۔۔ اٹھے جدھر نگاہ مدینہ دکھائی دے

دنیا کو دیکھنے کا مجھے شوق تھا نہ ہے ۔۔۔ ٹھوکر کہیں نہ کھاؤں بس اتنا دکھائی دے

جاگوں تو صرف ان کے خیالوں میں گم رہوں ۔۔۔ سو جاؤں تو فقط رخ آقا دکھائی دے

وہ شہر جس کا نام تو کعبہ نہیں مگر ۔۔۔ گلیوں میں جس کی رونق کعبہ دکھائی دے

بے نوری نگاہ کا اک فائدہ بھی ہے ۔۔۔ کانٹے سجھائی دیں نہ اندھیرا دکھائی دے

اقبال اپنی چشم بصیرت سے کام لو

یہ کیا ضرور آنکھ سے رستا دکھائی دے

باب التقریظ والانتقاد

Romance of Research

ذوق تحقیق

از عبدالمنان ہلالی

مرتبین: ڈاکٹر قیصر حسین باقری۔ ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی۔ ڈاکٹر عرفان احمد۔ صفحات ۲۵۳ + ۲۲۔ عمدہ کاغذ و طباعت۔ ملنے کا پتہ اور قیمت درج نہیں۔

یہ کتاب پروفیسر شمیم جیراجپوری کی حیات اور کارناموں کے بارے میں ان کے دوستوں اور شاگردوں نے مرتب کی ہے۔ پیش لفظ سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال، مشہور سائنس داں گوورد ھن مہتا اور عثمانیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید ہاشم علی نے لکھے ہیں۔ مضمون نگاروں میں کوئی شمیم صاحب کا عزیز اور بچپن کا دوست ہے (ضیاء الرحمن اعظمی) کوئی پرانا ہم جماعت ہے (شمس الاسلام فاروقی) کوئی ان کے ماتحت رہ چکا ہے (ایس کے ٹنڈن) کوئی رفیق (بی این ماتھر) تو کوئی رقیب (محمد رفیق صدیقی) مگر اکثریت ان کے شاگردان رشید کی ہے۔

پروفیسر شمیم جیراجپوری ہندوستان کے ان چند سائنس دانوں میں ہیں جنھوں نے اپنے میدان کار میں عالمگیر شہرت حاصل کی، پودوں اور مٹی میں رہنے والے اور دھاگے کی طرح باریک جانداروں یعنی NEMATODES پر انھوں نے گہرائی اور گیرائی سے تحقیق کی ہے۔ یہ

کیڑے پھلوں اور زراعت کی فصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گویا ان کی تحقیق کا صرف نظری پہلو نہیں بلکہ اطلاقی اور افادی پہلو بھی ہے۔ شمیم صاحب نے ان کیڑوں پر تنہا جس قدر تحقیقی کام کئے ہیں وہ کئی افراد بلکہ ایک ادارے کے کام کے برابر ہے۔ ہندوستان میں کوئی ان کا ہمسر نہیں اور مغرب میں چند ہی ان کے ہم پایہ ہوں گے۔

اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شمیم صاحب کو تحقیق سے ذہنی مناسبت اور گہرا قلبی لگاؤ ہی نہیں، عشق تھا۔ اسی عشق نے ان سے یہ ہمالیاتی کارنامہ انجام دلایا۔

اندر کمار گجرال، گوور دھن مہتا اور اکثر مضمون نگاروں نے شمیم صاحب کے کردار کی ایک اہم خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ وہ کٹھن اور دشوار حالات کے سامنے گھٹنے ٹیکنا نہیں جانتے۔ چیلنج سے نبرد آزما ہونا ان کی فطرت ہے۔ ان کی کامیابی ان کے کبھی ہار نہ ماننے والے رویہ میں پوشیدہ ہے۔ کتاب میں بکھرے بہت سارے واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں اپنے بارے میں شمیم صاحب کا مضمون بصیرت افروز ہی نہیں معروضی انداز بیان کا ایک نمونہ ہے:

"میرے دماغ کے ایک گوشے میں ہمیشہ یہ خواہش جاگزیں رہی کہ میں کوئی ایسا کام کر جاؤں جو میرے خاندان، احباب، اساتذہ اور تلامذہ کے لئے قابل فخر ہو۔ مجھ جیسے محدود صلاحیت اور اوسط درجہ کے اسناد رکھنے والے کے لئے یہ امر محال تھا۔ اس کے حصول کے لئے میرے اسلحہ خانے میں اگر کوئی ہتھیار تھا تو سخت محنت کا تھا، میں نے اس کا بھرپور استعمال کیا۔"

اسی سخت محنت نے شمیم صاحب کو معمولی سے غیر معمولی بنا دیا۔ ڈاکٹر باقری صاحب لکھتے ہیں کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے دوران شمیم صاحب ۱۸ سے ۲۰ گھنٹے روزانہ کام کرتے تھے۔

کام کی دھن میں اکثر کھانا بھی نظر انداز ہو جاتا۔ آخر اس جان لیوا محنت نے ان کی ساری توانائی نچوڑ لی، وہ کمزور اور لاغر ہو گئے، دیر تک کام کر کے اٹھتے تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا۔ ایسی حالت میں دو ساتھی سنبھالنے کے لئے ساتھ ساتھ چلتے۔ اُن دنوں والدین ان کو اپنے پاس بلاتے تو ان کو لکھ دیتے کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ جمع کرنے کے بعد ہی اعظم گڈھ آنا ہوگا بالآخر کم سے کم مقررہ مدت میں انہوں نے مقالہ تیار کر کے جمع کر دیا۔ پروفیسر بصیر احمد (صدر شعبہ) ان کی محنت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جب کام ختم کر کے شمیم صاحب گھر لوٹنے لگے تو ان کی جیب میں شعبہ کی تقرری کا پروانہ بھی تھا۔

لکچرر بننے کے بعد شمیم صاحب میں تن آسانی یا سہل پسندی نہیں آئی۔ وہ پہلے کی طرح تحقیق کے کام میں تن من سے لگے رہے اور پانچ سال کی قلیل مدت میں انہیں ڈی۔ ایس۔ سی کی ڈگری بھی مل گئی۔ ڈی۔ ایس۔ سی ڈگری پانے والوں میں وہ سب سے کم عمر فرد تھے۔ یعنی صرف ۳۰ سال کے۔

شمیم صاحب کے کام کے معیار اور مقدار کو دیکھ کر ۱۹۸۱ء میں انہیں برطانیہ کے International Institute of Parasitology میں Principal Nematologist کی اسامی پیش کی گئی جسے انہوں نے منظور کر لیا۔ اس سے پہلے بھی انہوں نے مغربی ممالک کے اسفار کئے۔ ان سب سے انہوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ جدید ترین آلات سے آراستہ مغربی معملوں میں بلند قامت سائنس دانوں کے ساتھ کئے تجربات نے ان کی معلومات اور اعتماد میں بہت اضافہ کیا اور جب وہ علی گڑھ لوٹے تو پروفیسر بنا دئے گئے، اپنے شعبہ کے سب سے کم عمر پروفیسر۔

۱۹۸۹ء میں شمیم صاحب ہندوستان کی ایک قدیم اور بہت باوقار تنظیم Zoolo

gical Survey of India کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے، انہوں نے علی گڑھ کی پرسکون عائلی زندگی کو چھوڑا۔ تدریس و تحقیق کے پسندیدہ مشاغل کو خیرباد کہا اور کلکتہ میں نئی ذمہ داریوں کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ ہرچند کہ وہ آزادی کے بعد کے سب سے کم عمر ڈائریکٹر تھے مگر وہ بہت کامیاب ڈائریکٹر رہے سخت محنت کے علاوہ یہاں ان کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے پروگراموں میں سب کو شریک کرتے تھے۔ ہر سطح پر مشورہ لیتے تھے۔ اس طرح ان کا منصوبہ سب کا منصوبہ بن جاتا تھا۔ گویا Ego - Involvement کا نفسیاتی اصول ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا اور کامیابی ان کے ہاتھ رہی۔

۱۹۹۱ء میں مادر درس گاہ نے انہیں پھر پکارا اور وہ لبیک کہتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ آف ایگری کلچر Institute of Agriculture قائم کرنے کے لیے علی گڑھ آگئے۔ انہوں نے ایک سال کے اندر انسٹی ٹیوٹ کا منصوبہ ICAR (Project) سے منظور کرالیا (جو اس سے قبل مسترد ہوگیا تھا) اور دو کروڑ ساٹھ لاکھ روپے کی گرانٹ بھی منظور کرالی اور جب پانچ سال بعد انہوں نے انسٹی ٹیوٹ کو ۱۹۹۶ء میں چھوڑا تو اس کی نئی عمارت مکمل ہوچکی تھی۔

۱۹۹۸ء میں ان کی زندگی کا سب سے بڑا چیلنج سامنے آیا۔ انہیں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر کا عہدہ پیش کیا گیا۔ انہوں نے اس چیلنج کو بھی قبول کرلیا۔ آج وہ ایک نئی اردو یونیورسٹی کو پروان چڑھانے میں خون پسینہ ایک کر رہے ہیں۔ جب انہیں چارج دیا گیا تو ان کے ہاتھ میں مولانا آزاد یونیورسٹی ایکٹ تھا اور سو ایکڑ زمین کا وعدہ۔ اور بس۔ مگر شمیم صاحب دوسری مٹی کے بنے ہیں۔ بقول ایس۔ کے ٹنڈن "اگر وہ تہیہ کرلیں تو ناممکن الحصول کو بھی حاصل کرلیں"۔ ڈھائی سال کے قلیل عرصے میں

انہوں نے کئی کورسز شروع کرا دئے اور تین علاقائی مراکز اور ۱۳ اسٹڈی سینٹر قائم کردئے (جواب ۴۷ ہوگئے ہیں)

اپنے مذکورہ بالا مضمون میں شمیم صاحب لکھتے ہیں کہ زندگی میں کامیابی کے لئے لفٹ نہیں ہوا کرتی۔ بلندی تک پہنچنے کے لئے سخت جد وجہد کرنی پڑتی ہے۔ وہ اس بات کو بھی بخوبی جانتے ہیں کہ طلباء تقریر اور تلقین سے نہیں متاثر ہوتے۔ اس کے لئے معلم کو اپنے عمل سے محنت اور لگن کی ایک مثال قائم کرنی ہوتی ہے ؎

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو
پیکر عمل بن کر غیب کی صدا ہوجا (اصغر)

شمیم صاحب کبھی تلقین شاہ نہیں بنے، وہ ہمیشہ پیکر عمل رہے۔

مرتبین نے یہ کتاب شایع کرکے ایک مفید کام انجام دیا ہے۔ ایک طرف شمیم صاحب کے کارناموں کو تخصص کے دائرے سے نکال کر عام لوگوں تک پہنچایا، تو دوسری طرف نئی سنجیدہ نسل کے لئے استقلال اور استقامت کا ایک نمونہ فراہم کردیا۔

کتاب کے آخر میں شمیم صاحب کی زندگی کے اہم سن و سال دئے گئے ہیں۔ کن اسامیوں کو انہوں نے زینت بخشی، کون سے اعزازات و انعامات حاصل کئے، کون سی کتابیں لکھیں، کن رسالوں کے ایڈیٹر رہے اور کون سے تحقیقی مقالات کن کن لوگوں کے ساتھ لکھے وغیرہ وغیرہ۔

مطبوعات جدیدہ

تاریخ شاہیہ نیشاپوریہ (فارسی) تالیف: قاسم علی نیشاپوری، تصحیح و مقدمہ از ڈاکٹر شاہ عبدالسلام، متوسط سے قدرے بڑی تقطیع، کاغذ و طباعت بہترین، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۳۰، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: رام پور رضا لائبریری، رامپور، یوپی۔

خطۂ اودھ زمانہ قدیم سے مذہب و ثقافت اور علم و دانش کا مرکز رہا ہے، مسلمانوں کے زمانۂ اقتدار میں اس علاقے کی متعدد تاریخیں فارسی اور اردو میں لکھی گئیں جو کچھ تو طبع ہوئیں لیکن بعض بوجوہ کتب خانوں میں گمنام اور طباعت و اشاعت سے محروم رہیں، نوابین اودھ کے واقعات پر مشتمل زیر نظر تاریخ بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اس کے مولف قاسم علی نیشاپوری نے والیان اودھ میں نواب سعادت علی خاں، نواب غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر اور نواب محمد علی شاہ کا زمانہ پایا۔ اس طرح اکثر واقعات وسوانح گویا چشم دید ہیں، دربار اور طرز حکومت کے متعلق بعض دلچسپ حکایتوں کو اسی وجہ سے درجہ استناد بھی حاصل ہوگیا ہے، چونکہ یہ تاریخ بعض انگریزی حکام کی فرمائش پر لکھی گئی اس لئے اس قسم کی اور تاریخوں کی مانند ان کی قصیدہ خوانی بھی کی گئی ہے۔ نواب نصیر الدین حیدر کے ذکر میں ان کو ہمیشہ عیش و عشرت اور صحبت نسواں میں مشغول بتایا گیا، یہ بھی کہ وہ "اقوال زنان بازاریہ را مثل وحی سماوی می دانست" تو دوسری جانب کرنل لوکو ارسطوئے زماں، افلاطون دوراں اور ہمہ صفات کمالیہ یعنی اخلاق، حلم، علم، شجاعت اور انتظام مملکت سے آراستہ بلکہ ان کا خاتم قرار دیا ہے۔ تاہم بعض تاریخی واقعات جیسے فرخ آباد پر لشکر کشی،

مسٹر چیری کا قتل اور نواب آصف الدولہ کے سفر بنارس کے متعلق خاصی واقفیت ہوجاتی ہے، نواب نصیر الدین حیدر اور بادشاہ بیگم کی آویزش میں ایسی باتیں بھی آگئی ہیں جن سے کسی زوال پذیر معاشرے کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، یہ قابل قدر کتاب مخطوطے کی شکل میں رامپور کی رضا لائبریری میں موجود تھی اس کے لائق اور فعال ذمہ دار ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی کی توجہ سے آزادی ہند کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر اس کی طباعت کا اہتمام کیا گیا، تصحیح و تعلیق اور مقدمہ کے لئے ڈاکٹر شاہ عبدالسلام کا انتخاب ہوا، جنہوں نے اسماء و اماکن کے اشاریے کے علاوہ ایک جامع مقدمہ بھی سپرد قلم کیا، حسن طباعت قابل دید و داد ہے، بعض نادر قلمی تصویروں کا عکس بھی دیا گیا ہے، اتنی اہم کتاب اور ایسی نفیس طباعت کے لئے رضا لائبریری اور فاضل مصحح تحسین و آفرین کے مستحق ہیں۔

مغربی میڈیا اور اس کے اثرات از جناب مولانا نذر الحفیظ ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۴۲، قیمت ۹۰ روپے، پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹، لکھنؤ۔

یورپ اور بعد میں امریکہ کی خالص مادہ و سرمایہ پرست سرشت کی بے سمتی اور بے راہ روی کے فروغ میں سب سے اہم کردار ذرائع ابلاغ کا ہے، تحریری و تقریری، کتابوں، رسالوں، اخباروں اور پھر ریڈیو اور ٹی وی اور خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعہ اقتدار و تسلط اور ذہنی و فکری فرماں روائی کی یہ جنگ روایتی اسلحوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ خطرناک اور مہلک ثابت ہوئی، حرف و عکس و صوت کی قوت کا ایسا نظارہ انسانی تاریخ میں شاید پہلے کبھی نہیں کیا گیا، دلچسپ بات یہ ہے کہ اس یلغار کے پس پردہ عیسائی حکومتوں سے زیادہ یہودی و صہیونی ارادے کارفرما ہے جن کا اصل ہدف ظاہر ہے اسلام ہے، اس کتاب میں صرف مغرب کے ذرائع ابلاغ کے اثرات کی نشاندہی نہیں کی گئی بلکہ یہودیوں کے عزائم اور اس باب میں ان کی ساری تگ و دو کی حقیقت بھی آشکارا کی گئی ہے۔

کتاب کا مقصد یہی ہے کہ اس فکری و ثقافتی یلغار اور سیلاب بلا کی مدافعت اور پشتیبانی کے لیے بیداری اور ہمت و محنت کی ضرورت کا احساس اور قوی ہو، ہندوستان اور عالم عرب میں جدید صحافت اور الکٹرونی ذرائع سے فاضل مصنف کا عملی تعلق رہا ہے، گہری نظر اور وسعت معلومات کی وجہ سے ان کی یہ کتاب بڑی مفید و وقیع ہوگئی ہے اور اردو میں شاید اس موضوع پر پہلی جامع کتاب ہے، آخر کے ابواب میں اسلامی ذرائع ابلاغ اور ان کے بہتر امکانات کے متعلق مباحث بھی بہت کارآمد ہیں، ہمارے پیش نظر دوسرا ایڈیشن ہے، ایک سال کے عرصے میں طبع ثانی سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، کتابت کی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں، فہرست میں کلیسا کو یکساں لکھ دیا گیا ہے۔

تصویریں اجالوں کی از جناب نورالحسن نقوی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۲۰۸، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق سے مولوی عبداللطیف تک تقریب بارہ پندرہ مشاہیر اہل علم و قلم اور کچھ نسبتاً گمنام شخصیتوں پر لکھے گئے تاثراتی و سوانحی خاکوں کا یہ مجموعہ چند ہم عصر سے شروع ہونے والی خاکہ نگاری کا گویا نقطہ عروج ہے، فاضل مصنف کی اور بھی خاصی کتابیں ہیں، تاریخ ادب، شعر و تنقید ان کے پسندیدہ موضوع ہیں لیکن ان کی زیادہ تر کتابیں سوانح و تراجم نگاری سے متعلق ہیں، یہ ان کا طبعی ذوق ہے اور زیر نظر مجموعہ مضامین اس کی بہترین مثال ہے، ان کی زندگی علی گڑھ کے لیے وقف ہے، قدرتاً جن شخصیتوں سے انہوں نے اکتساب نور کیا ان کا مطلع انوار اسی علی گڑھ کا آسمان تھا، حسرت موہانی، ذاکر صاحب، آل احمد سرور، علی محمد خسرو، سید حامد، کرنل زیدی، نسیم فاروقی، اطہر پرویز جس کے ماہ و انجم تھے، ان کے علاوہ مولانا آزاد، مولانا حفظ الرحمن، مولوی محمود عباسی بجائے خود روشنی کے مینار تھے، نقوی صاحب نے ان سب کی تصویروں کو اور پس منظر کے ہر نقش کو اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ ان پر تصویر کا گمان ہی نہیں ہوتا بلکہ اصل پیکر زندہ و تابندہ نظر آتا ہے، جزئیات پر گہری نظر اور مشاہدہ کی شرافت و صداقت اور زبان و اسلوب کی لطافت و نزاکت نے ان خاکوں کو زندگی بخش دی، بین السطور ملک و ملت کی خدمت کا جذبہ، ایثار، قربانی، بے نفسی، دردمندی اور اس کے برعکس کیفیتوں کی مثالیں بھی ملتی جاتی ہیں، مولوی عبداللطیف کا کردار ناقابل فراموش ہے، ہاں مولانا آزاد کے ذکر میں دارالمصنفین کی جگہ غلطی سے ندوۃ العلماء، شبلی اکیڈمی کی بجائے صرف اکیڈمی لکھ دیا گیا ہے۔

نیرنگ نظر از جناب ڈاکٹر افغان اللہ خان، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۷، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ ادبی مرکز، جامع مسجد، اردو بازار، گورکھپور۔

گورکھپور یونیورسٹی کے لائق استاد اور اس کتاب کے مصنف کی ادبی و تاریخی اور تنقیدی تحریروں کے اس انتخاب میں زیادہ تر مضامین گورکھپور اور وہاں کی شخصیات کے متعلق ہیں، فراق اور ان کے والد عبرت گورکھپوری اور ہندی گورکھپوری کے علاوہ ایک مضمون میں گورکھپور کی علمی و ادبی تاریخ بڑے سلیقے سے پیش کی گئی ہے، دوسرے مضامین میں ملک محمد جائسی، نواب زکریا خاں ذکی دہلوی، احتشام حسین، اردو ہندی کہانی، انقلاب اودھ، چوری چورا کیس اور سلام سندیلوی کی شاعری وغیرہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے، مختصر ہونے کے باوجود یہ تحریریں تشنہ نہیں، ادب و تنقید میں کسی خاص مکتب فکر کی جگہ ایک متوازن اور شائستہ معروضی انداز نمایاں ہے، لائق مولف کو بھی احساس ہے کہ ادب محض تفنن طبع کی چیز نہیں، ادب کے نام پر لاحاصل کاوشوں میں مضرت بھی ہے اور گمراہی بھی، البتہ بعض جملے زور احتیاط کے متقاضی تھے مثلاً "حکیم برہم کی چالاکی بہت دنوں تک نہ چل سکی"۔

ع۔ص۔

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

(پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت ۱۹۹۸ میں قائم مرکزی یونیورسٹی)

نظامت فاصلاتی تعلیم

اعلان داخلہ۔ 2002-2001

اُردو ذریعہ تعلیم اور فاصلاتی طریقے سے درج ذیل کورسوں میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں

۱۔ بی اے / بی ایس سی / بی کام سال اول میں داخلہ بذریعہ اہلیتی امتحان۔

رسمی تعلیمی قابلیت نہ رکھنے والے امیدواروں کو بی اے / بی ایس سی / بی کام میں داخلے کے لئے اہلیتی امتحان میں کامیابی حاصل کرنی ہوگی۔ یہ امتحان 19 اگست 2001 بروز اتوار کو یونیورسٹی کے 47 اسٹڈی سنٹروں اور بعض دیگر مقامات پر منعقد ہوگا۔ امیدواروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ یکم جنوری 2002 کو اپنی عمر کے 18 سال مکمل کرلیں۔ اہلیتی امتحان کے لئے خانہ پُری کی ہوئی درخواست مع رجسٹریشن فیس 100 روپے وصول ہونے کی آخری تاریخ 21 جولائی 2001 ہے۔

2۔ بی اے / بی ایس سی / بی کام میں راست داخلہ　　3۔ چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے کمپیوٹنگ

کورس نمبر 2 اور 3 کے لیے ایسے امیدوار درخواست دینے کے اہل ہیں جنھوں نے کسی مسلمہ بورڈ / ادارے / یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ یا 10+2 یا ان کے مساوی امتحان میں کسی بھی ذریعہ تعلیم سے کامیابی حاصل کی ہو۔ انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دیئے گئے کورسوں کی فہرست پراسپکٹس میں شائع کی گئی ہے۔ خانہ پُری کی ہوئی درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ 15 نومبر 2001 ہے۔

نوٹ: بی ایس سی پروگرام صرف حیدرآباد، نظام آباد، بنگلور، گلبرگہ، ناندیڑ اور ممبئی میں اور کمپیوٹنگ پروگرام صرف حیدرآباد، کرنول، بنگلور، بھیونڈی اور ممبئی میں۔

چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے

4۔ اہلیت اردو بذریعہ انگریزی　　5۔ اہلیت اردو بذریعہ ہندی　　6۔ غذا اور تغذیہ

کورس نمبر 4، 5 اور 6 میں داخلہ کے لئے کسی رسمی تعلیمی قابلیت یا اہلیتی امتحان میں کامیابی کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ امیدواروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ یکم جنوری 2002 کو اپنی عمر کے 18 سال مکمل کرلیں۔ خانہ پُری کی ہوئی درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ 15 نومبر 2001 ہے۔

یونیورسٹی اور اس کے پروگراموں سے متعلق تفصیلی معلومات پراسپکٹس میں فراہم کی گئی ہیں۔ بی اے / بی ایس سی / بی کام کورسوں کے لئے پراسپکٹس مع درخواست فارم کی قیمت شخصی طور پر حاصل کرنے کی صورت میں 35 روپے اور بذریعہ ڈاک 40 روپے ہے۔ کسی بھی سرٹیفکیٹ کورس کے لئے پراسپکٹس مع درخواست فارم کی قیمت نقد ادا کرنے پر 10 روپے اور بذریعہ ڈاک 15 روپے ہے۔ بذریعہ ڈاک پراسپکٹس منگوانے کے لئے مطلوبہ رقم کا بینک ڈرافٹ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نام جو حیدرآباد میں قابل ادا ہو، صرف نیچے دیے گئے پتے پر ہی ارسال کریں۔

ڈائرکٹر، ڈسٹنس ایجوکیشن، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، ڈیلکس کالونی، ٹولی چوکی، حیدرآباد۔ 500 008

پروفیسر محمد سلیمان صدیقی، رجسٹرار اور ڈائرکٹر (انچارج) ڈسٹنس ایجوکیشن

تصانیف مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

* اسوہ صحابہؓ: (حصہ اول) اس میں صحابہ کرامؓ کے عقائد، عبادات، اخلاق و معاشرت کی تصویر پیش کی ئی ہے۔ قیمت ۵۰/روپے
* اسوہ صحابہؓ: (حصہ دوم) اس میں صحابہ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ قیمت ۵۶/روپے
* اسوہ صحابیاتؓ: اس میں صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کو یکجا کردیا گیا ہے۔ قیمت ۳۰/روپے
* سیرت عمر بن عبد العزیز: اس میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی مفصل سوانح اور ان کے تجدیدی رناموں کا ذکر ہے۔ قیمت ۳۲/روپے
* امام رازی: امام فخرالدین رازی کے حالات زندگی اور ان کے نظریات و خیالات کی مفصل تشریح کی گئی ہے۔ قیمت ۳۵/روپے
* حکمائے اسلام: (حصہ اول) اس میں یونانی فلسفہ کے مآخذ، مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اشاعت اور ںویں صدی تک کے اکابر حکمائے اسلام کے حالات، علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل ہے۔ قیمت ۵۰/روپے
* حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات پر مشتمل ہے۔ قیمت ۳۰/روپے
* شعر الہند: (حصہ اول) قدماء سے دور جدید تک کی اردو شاعری کے تغیر کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اتذہ کے کلام کا باہم موازنہ۔ قیمت ۹۲/روپے
* شعر الہند: (حصہ دوم) اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی ثیت سے تنقید کی گئی ہے۔ قیمت ۵۵/روپے
* اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح اور ان کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کی تفصیل کی گئی ہے۔ قیمت ۸۰/روپے
* تاریخ فقہ اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات ذکر گئی ہیں۔ قیمت ۲۵/روپے
* انقلاب الامم: سر تطور الامم کا انشاء پردازانہ ترجمہ۔ قیمت ۵۵/روپے
* مقالات عبد السلام: مولانا مرحوم کے اہم ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ۶۰/روپے